قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

اشاعت کا اٹھہترواں سال

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

اپریل 2021ء

"لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ" (الحدیث) حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے



علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْیَصُمْهُ ؕ وَمَنْ كَانَ مَرِیْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ ؕ یُرِیْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۫ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۸۵﴾ (2:185)

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے، کہ اِس اجتماعی اور عسکری ٹریننگ (اور تربیتِ نفس) کے لئے رمضان کے مہینے کا انتخاب کیوں کیا گیا؟ اس لئے کہ یہ وہ مہینہ ہے جس میں نزولِ قرآن کی ابتداء ہوئی تھی — وہ قرآن جو تمام نوعِ انسانی کو اس کی منزلِ مقصود تک پہنچنے کی ایسی راہ بتاتا ہے جو واضح اور اُبھری ہوئی ہے، اور جو مستقل اَقدار کے پیمانے پیش کرتا ہے تاکہ حق اور باطل میں تمیز ہوتی رہے۔ روزوں کا نظم وضبط، اِس عظیم پروگرام کے لئے مستعد رہنے کی سالانہ ٹریننگ ہے۔ سو جو شخص، اس مہینے میں، اپنے گھر پر موجود ہو، تو اُسے چاہئے کہ اس مہینے کے روزے رکھے۔ لیکن جو مریض ہو، یا حالتِ سفر میں، تو وہ دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرے۔ (اور جو بہ مشقت روزہ رکھ سکتا ہو اس کے متعلق پہلے کہا جا چکا ہے۔ یہ رعایتیں اس لئے ہیں کہ) خدا تمہارے لئے آسانیاں چاہتا ہے، سختی اور تنگی پیدا کرنا نہیں چاہتا۔ اس لئے تم دوسرے دِنوں میں گنتی پوری کر لیا کرو۔ (مفہوم القرآن از پرویز)

طلوعِ اسلام کا مقصد

جو احباب طلوع اسلام سے تعارف نہیں رکھتے ان کی آگاہی کے لئے ہم طلوع اسلام کے مقصد کو وقتاً فوقتاً سامنے لاتے رہتے ہیں:

1- تنہا عقل انسانی زندگی کے مسائل کا حل دریافت نہیں کرسکتی۔ اسے اپنی راہنمائی کے لئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی ضرورت۔

2- خدا کی طرف سے عطا شدہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے جو تمام نوع انسانی کے لئے ابد تک ضابطہ ہدایت ہے۔ لہٰذا اب نہ خدا کی طرف سے کسی کو وحی مل سکتی ہے نہ کوئی نبی یا رسول آسکتا ہے۔ قرآن کریم خدا کی آخری کتاب اور حضور رسالتمآب ﷺ خدا کے آخری نبی اور رسول ہیں۔

3- قرآن کریم کا ہر دعویٰ علم پر مبنی ہے اور اس کے حقائق زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ہیں۔ قرآنی حقائق کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ جس حد تک انسانی علم ترقی کر چکا ہے وہ انسان کے سامنے ہو اور چونکہ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ خدا نے تمام کائنات انسان کے لئے تابع تسخیر کر رکھی ہے اس لئے خدائی پروگرام کو پورا کرنے کے لئے کائناتی قوتوں کی تسخیر ضروری ہے۔

4- نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ مقدسہ، شرف و عظمت انسانیت کی معراج کبریٰ ہے۔ یہی وہ پاکیزہ سیرت ہے جو تمام نوع انسانی کے لئے اسوۂ حسنہ (بہترین نمونہ) ہے۔ حضور ﷺ کی سیرت طیبہ کا جو حصہ قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے اس کے قطعی یا یقینی ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔ باقی رہا وہ حصہ جو قرآن سے باہر ہے سو اس میں اگر کوئی بات ایسی ہے جو قرآن کے خلاف جاتی ہے یا جس سے حضور ﷺ پر (معاذ اللہ) کسی قسم کا طعن پایا جاتا ہے تو ہمارے نزدیک وہ بات غلط ہے۔ اسے حضور ﷺ کی طرف منسوب نہیں کرنا چاہئے۔ یہی اصول صحابہ کبارؓ کی سیرت مقدسہ کے سلسلہ میں بھی سامنے رکھا جانا چاہئے۔ جہاں تک حدیث کا تعلق ہے ہم ہر اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں جو قرآن کریم کے مطابق ہو یا جس سے حضور نبی اکرم ﷺ یا صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار نہ ہوتی ہو۔

5- دین کا مقصد یہ ہے کہ وہ انسانوں کو دوسرے انسانوں کی محکومی سے چھڑا کر ان سے خالص قوانین خداوندی کی اطاعت کرائے۔ قوانین کی یہ اطاعت ایک نظام مملکت کی رو سے ہوسکتی ہے اس کے بغیر دین (جو نظام زندگی کا نام ہے) متمکن نہیں ہوسکتا۔

6- رسول اللہ ﷺ نے سب سے پہلے دین کا نظام قائم فرمایا۔ اس نظام میں قرآن کریم کے احکام و قوانین کی اطاعت کرائی جاتی تھی اور جن امور میں قرآن کریم نے صرف اصول دیئے ہیں، ان کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے امور مملکت امت کے مشورہ سے سرانجام پاتے تھے۔

7- رسول اللہ ﷺ کے بعد دین کا وہی نظام حضور ﷺ کے خلفائے راشدینؓ نے جاری رکھا۔ اس میں امور مملکت سرانجام پانے کا وہی طریقہ تھا جو

بقیہ صفحہ نمبر 66 پر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

اپریل 2021ء

جلد 74 | شمارہ نمبر 4

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: اعمالِ صالح اور روٹی کا مسئلہ	ادارہ	4
بیادِ علامہ غلام احمد پرویزؒ	شیخ اللہ دتا ایڈووکیٹ، لاہور	6
روزوں کا مقصود و منتہیٰ	غلام احمد پرویز	13
اسلام کے مقابل اسلام (گذشتہ سے پیوستہ)	ادارہ	20
محمد سلمان غانم سے ایک مکالمہ	آصف جلیل، کراچی	33
تحریکِ طلوعِ اسلام اور جماعت اسلامی کی فکری قربتیں	خواجہ ازہر عباس، کراچی	36
دوقومی نظریہ پاکستان کی اسلامی مملکت میں انسانی ذات کا ارتقاء	ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد	42
بچوں کا صفحہ: نئے پڑوسی	ادارہ	57

چیئرمین: خورشید انور

مجلسِ ادارت

ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر منظور الحق

خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِتعاون: 50 روپے فی پرچہ

پاکستان: 600 روپے سالانہ

رجسٹرڈ ڈاک: 1000 روپے سالانہ

رجسٹرڈ ڈاک: 5000 روپے سالانہ

ENGLISH SECTION

Is Sexual Relationship a Private Matter? 59

By G. A. Parwez (Translated by: Mansoor Alam)

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان) Phone: 042-35714546

idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam

National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulbarg Lahore

For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672

For International Transactions
IBAN:PK36NBPA0465004073177672
Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

ناشر: عرفان راٹھور اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

عقابی شان سے جھپٹے تھے جو، بے بال و پر نکلے
ستارے شام کے خونِ شفق میں ڈوب کر نکلے
ہوئے مدفونِ دریا زیر دریا تیرنے والے
طمانچے موج کے کھاتے تھے جو، بن کر گہر نکلے
غبارِ رہ گزر ہیں، کیمیا پر ناز تھا جن کو
جبینیں خاک پر رکھتے تھے جو، اکسیر گر نکلے
ہمارا نرم رو قاصد پیامِ زندگی لایا
خبر دیتی تھیں جن کو بجلیاں وہ بے خبر نکلے
حرم رسوا ہوا پیر حرم کی کم نگاہی سے
جوانانِ تتاری کس قدر صاحب نظر نکلے
زمیں سے نوریانِ آسماں پرواز کہتے تھے
یہ خاکی زندہ تر، پائندہ تر، تابندہ تر نکلے
جہاں میں اہل ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے، اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے
یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیر ملت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گر تقدیر ملت ہے

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

اعمالِ صالح اور روٹی کا مسئلہ

اگلے دنوں ایک فوجی دوست نے پوچھا کہ قرنِ اول میں مسلمان سپاہیوں (مجاہدین) نے جو محیر العقول کارنامے کر دکھائے، اس کی بنیادی وجہ کیا تھی؟ ہم نے کہا کہ ذرا اس پر غور کیجئے کہ وہ کون سے اسباب و احساسات ہیں جن کی وجہ سے ایک سپاہی میدانِ جنگ سے بھاگ جاتا یا کمزوری دکھاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں پہلا احساس یہ ہوتا ہے کہ میں مر جاؤں گا اور دوسرا احساس یہ کہ میرے بعد میرے بیوی بچوں کا کیا بنے گا؟ وہ تباہ ہو جائیں گے۔ قرآن نے یہ تصور دیا کہ موت صرف نقلِ مکانی کا نام ہے۔ کوئی انسان موت سے ختم نہیں ہو جاتا۔ وہ زندہ رہتا ہے۔ بس صرف مکان کی تبدیلی ہوتی ہے۔ (اسی لئے ہمارے ہاں موت کے لئے انتقال کا لفظ رائج تھا جو اس تصور کی ٹھیک ترجمانی کرتا تھا)۔۔۔ مسلمان سپاہی کے دل میں یہ تصور، ایمان کی حیثیت لئے ہوتا ہے۔ اس لئے اسے موت کا ڈر ہی نہیں ہوتا۔ باقی رہا یہ دھڑکا کہ میرے مرنے کے بعد میرے بیوی بچوں کا کیا ہوگا، تو اس کی ذمہ داری پہلے ہی سے مملکت نے لے رکھی ہوتی ہے۔ لہٰذا اسے یہ غم بھی نہیں ستاتا۔ اب سوچئے کہ جس سپاہی کو نہ موت کا ڈر ہو۔ اور نہ ہی اپنے پسماندگان کے مستقبل کی طرف سے کسی قسم کا تردد، اس کے زورِ بازو کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ اس کی تو نگاہ سے (اقبالؔ کے الفاظ میں) تقدیریں بدل جاتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کو اگر روٹی کی فکر سے آزاد کر دیا جائے، تو وہ جِنّ بن جاتا ہے۔ اس کی وہ صلاحیتیں جو اس سے پہلے، چکی کے اس پاٹ۔۔ (Mill-Stone) کے نیچے بری طرح سے دبی اور کچلی رہتی ہیں، اس طرح ابھر کر باہر آتی ہیں، کہ وہ کچھ اور کی اور مخلوق بن جاتا ہے۔ وہ صحیح انسانی پیکر میں سامنے آتا ہے۔ اس کی عظمتِ انسانیت چھلک کر باہر آ جاتی ہے۔ اس کی ممکناتِ زندگی ایک ایک کر کے، محسوس پیکر اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ، وہ کچھ کر کے دکھا دیتا ہے جسے عام سطح کا انسان، معجزات اور کرامات سمجھتا ہے۔ حالانکہ وہ نہ کوئی معجزہ ہوتا ہے نہ کرامت۔ روٹی کے چکر میں پھنسا ہوا انسان، کبھی انسانی سطح پر آ نہیں سکتا۔ اسے کسی انسانی مسئلہ کی طرف دھیان دینے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے جو قرآنِ کریم نے حضرات انبیاء کرامؑ سے کہا کہ:

يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ط (23:51)

اے ہمارے رسولو! خوش گوار رزق کھاؤ اور اعمال صالح کرو۔

آپ نے غور فرمایا کہ اعمالِ صالح اور روٹی کا کس طرح چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یہ جو ہمارے ہاں ایک مذہبی افسانہ مشہور ہے کہ ابلیس نے آدم کو دانۂ گندم کھلا دیا جس سے وہ جنت سے باہر نکال دیا گیا' تو اس سے کسی سیانے نے اسی طرف اشارہ تو نہیں کیا کہ انسان کو جنت سے نکلوانا مقصود ہو تو اسے روٹی کی فکر میں الجھا دو۔ اس کی تائید خود قرآن سے بھی ہوتی ہے۔ اس نے قصۂ آدمؑ کے تمثیلی انداز میں بتایا ہے کہ آدمؑ جس جنت میں رہتے تھے' وہاں انہیں روٹی کی کوئی فکر نہیں تھی۔ وہاں ان کی کیفیت یہ تھی کہ۔۔۔ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ص (2:35) وہ جہاں سے جی چاہتا' پیٹ بھر کر کھا لیتا۔ اس سے کہا گیا کہ یاد رکھو! اگر تم ابلیس کے فریب میں آ گئے' تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ۔۔۔ يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى (20:117) تو وہ تمہیں اس جنتی زندگی سے نکلوا دے گا اور تمہیں اسی روٹی کی خاطر جگر پاش مشقتیں اٹھانی پڑیں گی۔ انسان اس کے فریب میں آ گیا' جس کا نتیجہ سرمایہ دارانہ نظام کی انفرادیت تھی۔ اس سے بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ج (20:123) کی انسانیت سوز جہنم وجود میں آ گئی۔ جس میں ہر فرد کا مفاد دوسرے فرد کے مفاد سے ٹکرانے لگا۔ تو انسان کو اس جہنم سے نکالنے کے لئے' آسمانی راہنمائی (وحی) کا سلسلہ شروع ہوا۔

ہمارے ہاں بدقسمتی سے ''اِمام مہدی'' کا صحیح مفہوم نظریاتی بحثوں اور معتقداتی پیچیدگیوں میں کھو کر رہ گیا' ورنہ (اگر وہ روایات صحیح ہیں تو) نبی اکرم ﷺ نے' ان میں صحیح قرآنی نظام کے سربراہ کی خصوصیات کی طرف اشارہ فرمایا تھا' نہ کہ کسی مافوق الفطرت راستے سے آنے والی منفرد شخصیت کی منفرد خصوصیات۔ آپ نے اس سربراہِ مملکتِ' اسلامیہ کی نمایاں خصوصیت یہ بتائی تھی کہ۔۔۔ یقسم المال صحیحاً۔۔۔ وہ مال کی صحیح صحیح تقسیم کرے گا۔ کسی نے پوچھا کہ مال کی صحیح تقسیم کا معیار کیا ہوگا۔ آپ نے فرمایا کہ۔۔۔ بالسوّیۃ بین الناس۔۔۔ تسوّیہ کے معنی ہوتے ہیں' کسی شے میں ہر قوت کا صحیح تناسب کے ساتھ موجود ہونا اور اس طرح اس کا اپنی انتہائی نشوونما تک پہنچ جانا۔ اَلسَّوِیُّ اس چیز کو کہا جاتا ہے جو ہر اعتبار سے افراط و تفریط سے محفوظ ہو اور ٹھیک تناسب رکھتی ہو۔ اِسْتَوَی الرَّجُلُ۔۔۔ کے معنی ہیں' اس شخص کا شباب اپنے انتہا تک پہنچ گیا'۔ لہٰذا مال کی تقسیم تسویۃً کے معنی یہ ہوں گے کہ معاشرہ میں سرمایہ کی تقسیم اس طرح ہو کہ نہ اس میں افراط ہو نہ تفریط بلکہ اس انداز سے کہ ہر شخص کی صحیح صحیح نشوونما ہو سکے اور اس کی صلاحیتیں بھرپور شباب تک پہنچ جائیں۔

شیخ اللہ دتا ایڈووکیٹ، لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بیادِ علامہ غلام احمد پرویزؒ

معزز سامعین کرام! السلام علیکم۔

آج 21 فروری 2021ء ہے اور اتوار کا دن۔ مجھے علامہ غلام احمد پرویز مرحوم کی وفات بمورخہ 24 فروری 1985ء کی یاد میں آپ سے خطاب کا موقع دیا گیا ہے۔

علامہ غلام احمد پرویزؒ عالمِ اسلام کے ایک منفرد سکالر تھے۔ وہ 9 جولائی 1903ء کو موجودہ مشرقی پنجاب کے شہر بٹالہ میں پیدا ہوئے۔ اپنے دادا چوہدری رحیم بخشؒ سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ان کی ہدایت پر علامہ محمد اقبالؒ سے قرآن فہمی کا اسلوب سیکھا جو محاورۂ عرب اور تصریفِ آیات پر مبنی تھا۔ بسلسلۂ ملازمت دہلی گئے تو علامہ محمد اقبالؒ کے مشورہ کے مطابق علامہ محمد اسلم جیراجپوری کی صحبت سے عربی ادب میں مہارت حاصل کی۔

علامہ محمد اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظم محمد علی جناح کی خواہش پر مجلہ طلوعِ اسلام کے دورِ ثانی کا آغاز سال 1938ء کے اپریل، مئی کے مشترکہ شمارہ سے کیا اور قرآنی تعلیمات کے فروغ کے ساتھ ساتھ، اس ماہوار مجلہ کے ذریعے قیامِ پاکستان کی تحریک کا راستہ ہموار کرنے میں بھرپور جدوجہد کا آغاز کیا اور مخالفین کے اعتراضات کو بے وقعت قرار دیا۔ اسی سلسلہ میں تحریکِ پاکستان کی قرآنی اساس کے موضوع پر قائداعظم کے ذاتی مشیر کے طور پر خدمات سرانجام دیں۔

علامہ غلام احمد پرویزؒ چار درجن سے زائد علمی کتب کے مُصنف تھے۔ اس کے علاوہ مجلہ طلوعِ اسلام کے صفحات پر پھیلے ہزاروں صفحات پر مشتمل مضامین ان پر مستزاد ہیں۔ وہ عمر کا اکثر حصہ باقاعدہ ہفتہ وار درسِ قرآن دیتے رہے جنہیں ریکارڈ کرلیا جاتا تھا۔ یہ ریکارڈ تحریری شکل میں اکتالیس سے زائد مجلدات پر مشتمل ہے۔ ان کی دیگر کتابوں کی تفصیل مجلہ طلوعِ اسلام بابت ماہ فروری 2021ء کے صفحات 57-58 پر شائع ہو چکی ہے۔

مرحوم نے 15 اکتوبر 1984ء کو آخری بار درس قرآن دیا اور پھر مسلسل بسترِ علالت پر رہے اور 24 فروری 1985ء کو اس دارِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ۔۔

ان کے اس تذکرہ کے بعد، میرا ان کی قرآنی تعلیمات کے حوالہ سے آپ سے گفتگو کا موضوع ہے ''نبی کریم ﷺ کا اسوۂ حسنہ۔''

اُسوۂ حسنہ

آپ ﷺ کا اسمِ گرامی قرآنِ مجید میں پانچ مقامات پر درج ذیل انداز میں آیا ہے:

1۔ وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ؕ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ (61:6)

علامہ پرویزؒ کے مفہوم القرآن سے: یہی وہ قوم بنی اسرائیل تھی جس سے ان کے آخری نبی، عیسیٰ علیہ السلام ابن مریم نے کہا تھا کہ میں تمہاری طرف خدا کا فرستادہ ہوں، اور جو کچھ تمہارے پاس تورات (کتب سابقہ میں آیا تھا) اسے سچ کر دکھانے کے لئے آیا ہوں اور میں تمہیں اللہ کے ایک اور رسول ﷺ کی خوشخبری دیتا ہوں جو میرے بعد آئے گا۔ اس کا نام احمد ہوگا چنانچہ اب جب کہ وہ آنے والا رسول ﷺ ان کے پاس آچکا ہے، اور اپنے ساتھ واضح قوانین لایا ہے تو کہتے ہیں کہ (یہ خدا کی وحی نہیں) کھلا ہوا جھوٹ ہے (جسے اس نے خود ہی تراش لیا ہے)۔

2۔ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَاْئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۴﴾ (3:144)

مفہوم: موت اور مقاتلہ کا ذکر آ گیا ہے تو، اس ضمن میں ایک اور اہم اصول کا سمجھ لینا بھی ضروری ہے۔ وہ یہ کہ تم اپنی زندگی اور قوم کا راز، اپنے نظام کے استحکام میں سمجھو۔ اسے شخصیتوں کے ساتھ وابستہ مت کرو۔ چھوٹی چھوٹی شخصیتیں تو ایک طرف، اس باب میں تو محمد ﷺ جیسی بلند ترین شخصیت کا بھی یہ عالم ہے کہ وہ صرف خدا کا پیغام پہنچانے والا ہے۔ اس سے پہلے اسی طرح بہت سے پیغام پہنچانے والے آئے اور اپنا فریضہ ادا کر کے چلے گئے۔ لہٰذا اگر یہ پیغام رساں (محمد ﷺ) بھی کل کو فوت ہو جائیں یا قتل کر دیے جائیں (3:183؛ 3:185؛ 39:30) تو کیا تم سمجھو گے کہ اس کی موت سے یہ سارا نظام ختم ہو گیا؟ اور اس کے بعد تم اپنی قدیم رَوش کی طرف پلٹ جاؤ گے؟ جو ایمان کی رَوش پر قائم رہے گا اور اس نظام کی قدر شناسی کرے گا، تو اُسے اس کی کوششوں کا پورا پورا صلہ ملے گا۔ یعنی اس نظام کو رسول کے بعد بھی علیٰ حالہٖ قائم رکھنے سے اُس وقت رسول کا جانشین (یعنی اس نظام کی مرکزی اتھاریٹی) وہی فرائض سرانجام دے گا جو فرائض اس وقت یہ رسول (بہ حیثیتِ مرکزِ نظامِ خداوندی) سرانجام دیتا ہے۔ اس طرح دین (اسلام) آگے چلے گا۔

3۔ مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿۴۰﴾ (33:40)

مفہوم: (تم لوگوں کو، جو زید کی مطلقہ بیوی سے نکاح پر چہ میگوئیاں کرتے ہو، اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ) محمد ﷺ تم میں سے کسی لڑکے کا باپ نہیں (اگر کسی کو محبت سے بیٹا کہہ دیا جائے تو وہ بیٹا نہیں بن جایا کرتا نہ ہی یہ رسول اپنے خود ساختہ

احکام وضع کرتا ہے) وہ خدا کے احکام تم تک پہنچاتا ہے (اور انہی احکام کی خود اطاعت کرتا ہے۔ یہ احکام ایسے ہیں جن میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہوسکتا۔ نہ اس رسول کی زندگی میں نہ اس کے بعد، کیونکہ اس کے بعد) نبوت (یعنی خدا کی طرف سے وحی ملنے کا سلسلہ) ختم ہوگئی اور یہ سب اللہ کے لامحدود علم کی بنا پر ہوا (جو خوب جانتا ہے کہ نبوت کا سلسلہ کب تک جاری رکھنا چاہئے تھا، اور کب اسے ختم کر دینا چاہئے۔ جو کچھ انسانوں کی راہنمائی کے لئے دیا جانا مقصود تھا، وہ قرآن میں اپنی تکمیل تک پہنچ گیا اور قرآن کو ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا گیا۔ اس لئے اس کے بعد، نبوت کی ضرورت ہی نہ رہی)

4۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۙ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ (47:2)

مفہوم: اور جو لوگ اس نظام کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں یعنی اُس ضابطۂ زندگی (قرآن) پر ایمان رکھتے ہیں جو محمد ﷺ پر نازل کیا گیا ہے، اور جو ان کے نشوونما دینے والے کی طرف سے حقیقتِ ثابتہ ہے۔ اور خدا کے متعین کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ ان کے اس یقینِ محکم اور عملِ پیہم کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کے معاشرہ کی ناہمواریاں دور ہوجائیں گی اور ان کی صلاحیتیں نشوونما پاکر ان کی حالت سنوار دیں گی۔

5۔ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝۲۸ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّاۗءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاۗءُ بَيْنَهُمْ ۔۔۔(48:28-29)

مفہوم: اللہ نے اپنے رسول کو یہ ضابطۂ ہدایت یعنی حق پر مبنی نظام دے کر بھیجا ہی اس لئے ہے کہ یہ دنیا کے تمام خود ساختہ نظام ہائے زندگی پر غالب آکر رہے (اور یہ اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ اس جماعت کو اتنی قوت اور مقدرت حاصل ہو کہ یہ باطل کا نظام مٹا کر اپنا نظام قائم کر سکے)۔ اور خدا اس بات کی نگرانی کرنے کے لئے کافی ہے کہ ایسا ہو کر رہے۔

اور یہ ہوگا محمد ﷺ رسول اللہ اور اس کے رفقائے کار کی جماعت کے ہاتھوں۔ یہ جماعت بھی کیا عجیب وغریب جماعت ہے! ان کی کیفیت یہ ہے کہ یہ حق کے مخالفین کے مقابلہ میں چٹان کی طرح سخت ہیں، لیکن باہم دگر بڑے ہی نرم دل اور ہمدرد (5:54)

مذکورہ بالا پانچ حوالوں میں جہاں رسول ﷺ کے اسمِ گرامی کا تذکرہ ہے ایک چیز بالکل نمایاں ہے کہ ان کا فریضۂ رسالت، انسانوں تک ہدایتِ خداوندی پہنچانا اور اس ہدایت کے مطابق حق پر مبنی نظام قائم کر کے، اسے تمام دنیا کے خود ساختہ نظام ہائے زندگی پر غالب کرنا تھا۔ یہ صرف اپنے رفقائے کار پر مبنی ایک اُمت کی تشکیل سے ممکن تھا جس کے لئے آپ نے ساری زندگی صرف کر دی اور کہیں سست ہونے یا تھکنے کا نام نہیں لیا۔

قبل اس کے کہ میں آپ کی مجاہدانہ زندگی کا ایک نمونہ آپ کے سامنے پیش کروں، مناسب سمجھتا ہوں کہ آپ ﷺ کے متبع مومنین کے آپ سے تعلق اور ان کے رویہ پر ایک آیت جزوی طور پر پیش کروں:

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ۡ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۱۵۷ (7:157)

مفہوم: (اب ہماری ربوبیت اور رحمت ان لوگوں کے حصہ میں آئے گی جو نظامِ ربوبیت قائم کرنے کے لئے) اس رسول ﷺ کے پیچھے پیچھے چلیں گے جو (قرآن ملنے سے پہلے) اُمی تھا (29:48)۔۔۔لہٰذا جو لوگ اس کی نبوّت پر ایمان لے آئیں، اور اس کے پیش کردہ پیغام کے مخالفین کے لئے روک بن کر اس کی مدافعت کریں، اس نظام کے قیام میں اس کی مدد کریں اور اس مقصد کے لئے اس روشنی کو اپنے لئے چراغ راہ بنائیں جسے اس رسول ﷺ کی طرف نازل کیا گیا ہے۔ تو یہی لوگ ہوں گے جن کی کھیتیاں پروان چڑھیں گی، اور جو کامیاب و کامران زندگی بسر کریں گے۔

یہاں میں ایک لطیف نکتہ پیش کرنا چاہتا ہوں جو تعلیماتِ قرآنی سے سمجھ میں آیا ہے۔

قرآن کریم نے سورۃ الحجرات میں کہا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ (49:2)

اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَاۗءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝۴ وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۵ (49:4-5)

ترجمہ: اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اپنی آواز کو نبی ﷺ کی آواز سے اونچا نہ جانے دو جیسا کہ تم ایک دوسرے کے ساتھ باتیں کرتے ہو۔ اس طرح کرنے سے تمہارے سارے اعمال رائگاں چلے جائیں گے اور تمہیں اس کی خبر بھی نہ ہونے پائے گی (یعنی تمہاری اس روش کا غیر شعوری طور پر یہ نتیجہ نکلے گا)۔

اور بعض اس قسم کے نادان بھی آجاتے ہیں کہ وہ (اجتماعی نظم وضبط تو ایک طرف، عام آدابِ معاشرت تک کو بھی ملحوظ نہیں رکھتے۔ مثلاً وہ) آپ ﷺ کو مکان کے باہر سے چلا چلا کر پکارنا شروع کر دیتے ہیں۔ ظاہر ہے نام لیکر۔ انہیں چاہئے تھا کہ انتظار کریں تاکہ آپ ﷺ گھر سے باہر آجائیں (پھر جو بات کرنی ہے، آدابِ محفل کو ملحوظ رکھتے ہوئے کریں)۔ یہ طرزِ عمل ان کے حق میں بہتر ہے۔ بہرحال (چونکہ یہ لوگ ایسا کچھ محض نادانی اور جہالت سے کرتے ہیں، اس لئے) اللہ ان سے درگزر کرکے، ان کے لئے ایسے سامان پیدا کرتا ہے جن سے ان کی حفاظت بھی ہو جائے اور نشوونما بھی۔

ان آیاتِ مبارکہ سے ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو، عام انداز سے جیسے لوگ ایک دوسرے کو نام لے کر اونچا اونچا پکارتے ہیں، آواز دینا یا پکارنا بے عقلی ہے، نادانی ہے اور ان کے اعلیٰ مقام کے خلاف ہے۔ اس سے، ایسا کرنے والوں کے

سارے اعمال رائگاں چلے جاتے ہیں۔ حبط ہو جاتے ہیں اور انہیں اس کا پتہ تک نہیں چلتا۔

آج کل لوگ جوشِ نعت گوئی میں نبی کریم ﷺ کا اسمِ گرامی ''یا'' کے خطاب سے لیتے ہیں یا مسجد کے محراب اور دوسری جگہوں پر یا محمد ﷺ بڑے شوق سے لکھتے ہیں۔ یہ صریحاً نادانی اور بے عقلی ہے اور اپنے سارے اعمال ضائع کر دینے کے مترادف۔ ایسا ہرگز نہیں کرنا چاہئے۔ عام گفتگو یا تقریر و تبلیغ میں جہاں نبی کریم ﷺ کا تذکرہ درکار ہو، وہاں اسمِ گرامی لیا جا سکتا ہے لیکن انہیں خطاب کے طور پر ''یا محمد ﷺ'' نہیں کہا جا سکتا۔ اگر انہیں خطاب کرنا ضروری ہو تو یا رسول اللہ ﷺ۔ یاایھا الرسول اور یا ایھا النبی کے الفاظ سے خطاب کرنا مناسب ہوگا۔

اس بارے احتیاط کا تقاضا بے حد اہم ہے۔ اسے مدِنظر رکھنا چاہئے کیوں کہ خود اللہ تعالیٰ نے جہاں جہاں قرآنِ کریم میں دوسرے انبیاء کا تذکرہ کیا ہے، وہاں اگر انہیں خطاب کی ضرورت پڑی ہے تو یا کہہ کر نام سے مخاطب کیا ہے۔ مثلاً یا آدم علیہ السلام (7:119، 2:33، 35) یا نوح علیہ السلام (11:46-48) یا ابراہیم علیہ السلام (47:104) یا موسیٰ علیہ السلام (7:144; 20:11، 17، 19، 40) یا عیسیٰ علیہ السلام (5:110، 116؛ 3:55) یا ذکریا علیہ السلام (19:7) یا داؤد علیہ السلام (38:26) یا یحیٰ علیہ السلام (19:12)۔ لیکن پورے قرآن مجید میں کسی ایک جگہ بھی آپ ﷺ کے اسمِ گرامی سے پہلے یا کے ساتھ خطاب نہیں کیا بلکہ یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ (70، 65، 8:64؛ 9:73، 28؛ 33:1، 59، 50، 33:45؛ 60:12؛ 65:1؛ 66:1؛ 66:9) کہہ کر خطاب کیا ہے اور یٰٓاَیُّهَا الرَّسُوْلُ سے (67، 3:41) میں، یٰٓاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ سے (73:1)، یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ سے (74:1) میں خطاب فرمایا ہے۔

جس بات سے جماعتِ مؤمنین کو روکا ہے کہ وہ آپ ﷺ کو آپ کے نام سے نہ پکاریں (جیسے لوگ ایک دوسرے کو پکارتے ہیں) تو خود بھی آپ ﷺ کو نام لیکر نہیں پکارا۔ یہ انتہائی ادب اور وقار کا مقام ہے۔

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر　　نفس گم کردہ می آید جنیدؒ و بایزیدؒ ایں جا

مجھے یاد ہے کہ اب سے کوئی دس بارہ سال قبل میں نے اپنے درس میں اس کا تذکرہ کیا تو ایک صاحب نے بتایا کہ اس نے اس سے پہلے ایک شاعر سیّد عاصم گیلانی کا یہ شعر پڑھا ہوا ہے:

میں انؐ کا نام لے کے پکاروں تو کس طرح　　خالق نے بھی نہ جنؐ کو پکارا ہو نام سے

قرآن کریم میں اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ کا تذکرہ سورۃ الاحزاب میں آیا ہے۔ دیکھئے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ﴿٢١﴾ (33:21)

مفہوم: (بہر حال یہ تھا نقشہ جنگِ احزاب کے وقت، جب مصائب اور مشکلات، اپنی انتہا تک پہنچ چکی تھیں۔ باہر سے دشمن کی مخالفت سیلابِ بلا کی طرح اُمنڈ کر آ رہی تھی اور اندر سے منافقین کی فریب کاریاں اور حیلہ سازیاں، قدم قدم پر

پریشانی کا موجب بن رہی تھی۔ نامساعد حالات کی اس شدت میں بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں، لیکن تم نے دیکھا کہ اس طوفانِ بلاخیز میں تمہارا رسول کس طرح، روشنی کے مینار کی طرح جم کر کھڑا تھا اور اس کے پائے استقامت میں کہیں ذرا سی لغزش بھی آنے نہیں پائی) رسول کی یہ استقامت تمہارے پریشان قلوب کے لئے وجۂ ہزار سکون واطمینان اور ہر اس شخص کے لئے بہترین نمونہ تھی (اور ہے) جو خدا کے قانون کی ہمہ گیری اور نتیجہ خیزی پر یقینِ کامل رکھے، مستقبل کی زندگی کی خوشگواریوں پر جس کی نگاہ ہو، اور جو ہر وقت قانونِ خداوندی کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھے (60:4)۔

وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۫ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّاۤ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا (33:22)

مفہوم: اسی کا اثر تھا کہ جب مومنینِ صادقین نے دشمن کے لشکرِ جرار کو دیکھا تو، بجائے اس کے کہ ان پر خوف وہراس طاری ہو، وہ پکار اُٹھے کہ ہاں! خدا اور اس کے رسول (نظامِ خداوندی) نے ہم سے جو وعدہ کیا تھا اس کے پورا ہونے کا وقت آ گیا۔ اب ہر شخص دیکھ لے گا کہ وہ کس طرح حرفاً حرفاً سچ ہو کر تمہارے سامنے آتا ہے۔ یعنی وہی لشکر جن سے منافقین پر موت کی غشی طاری ہو رہی تھی، مؤمنین کے لئے ایمان کے استحکام کا موجب بن گئے اور ان کے جذباتِ اطاعت شعاری میں مزید اضافہ ہو گیا (24:55؛3:173۔175)۔

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۝ (33:23)

مفہوم: یہ مؤمنین وہ مردِ میدان ہیں جو اپنے اس دعویٰ کو سچ کر دکھاتے ہیں جو انہوں نے اپنے خدا کے ساتھ کیا تھا (9:111)۔ ان میں سے کچھ تو وہ ہیں جو اپنی جان دے کر ایفائے عہد کر چکے ہیں اور باقی اس انتظار میں ہیں کہ کب حکم ہو اور وہ سرفروشی کے لئے میدان میں جا پہنچیں۔ یہ وہ تمام مخلص بندے ہیں جنہوں نے اپنے عہد و پیمان میں ذرا سی تبدیلی بھی نہیں کی۔

یہ ہے نبیٔ کریم ﷺ کا اسوہ حسنہ اور یہی ہے مومنین صادقین کی اطاعتِ رسول کا جذبہ جس کا تذکرہ جنگِ خندق / احزاب کے حوالہ سے قرآنِ کریم میں آیا ہے۔ نبیٔ کریم ﷺ نے ہجرتِ مدینہ کے بعد ایسی ہی اور مہمات کا بھی اہتمام کیا تھا جس کی کل تعداد 82 بنتی ہے۔ ان میں سے ایسی مہمات یا یورشیں جن میں آپ ﷺ بنفسِ نفیس شریک ہوئے وہ 26 ہیں اور باقی مہمات 56 ہیں جن میں آپ ﷺ کے حکم پر کسی دوسرے صحابیؓ نے قیادت فرمائی۔ جن مہمات میں آپ ﷺ نے خود مقصد اور ارادے کے ساتھ شرکت فرمائی، انہیں غزوات کہتے ہیں اور جن فوجی دستوں کی سربراہی کسی دوسرے صحابیؓ کے سپرد ہوئی، انہیں سرایا کہا جاتا ہے۔ ان غزوات وسرایا کی تفصیل طول طویل ہے۔ اسے ہم کسی دوسرے موقع کے لئے اٹھا رکھتے ہیں:

علامہ غلام احمد پرویز مرحوم نے اپنے درسِ قرآن (سورۂ احزاب) مورخہ 28 دسمبر 1979ء میں فرمایا تھا۔

''میں اس مقام پر اتنا عرض کردوں کہ یہ آیۂ مبارکہ (33:21) سورۃ الاحزاب کے اس ضمن میں آئی تو اس مقام پر ہے، جہاں رسول اللہ ﷺ نے مجاہدین کے لئے اس طرح کا نمونہ پیش کیا تھا۔لیکن یہ جو رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ اُسوہ بنتی ہے، نمونہ بنتی ہے، میرا یہ ایمان ہے کہ یہ صرف اسی موقع کی بات نہیں بلکہ نبی اکرم ﷺ کی ساری زندگی ہمارے لئے قیامت تک کے لئے بہترین نمونہ ہے۔ وہی ہے قالب جس کے اندر ہمارے ایمان جائیں تو مومن بن کر نکلتے ہیں۔ حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ ہمارے لئے ہی نہیں بلکہ نوعِ انسانی کے لئے، پوری کی پوری انسانیت کے لئے، اسوۂ حسنہ ہے۔ عزیزانِ من! وہی صحیح پیٹرن (قالب) ہے۔زمانے کی ریگِ رواں پر وہی نقوشِ قدم ہیں جو ستاروں کی طرح جھلملاتے تابندہ چلے جاتے ہیں اور کاروانِ انسانیت کو ان کی صحیح منزل کے لئے نشاندہی کرتے ہیں۔اگر نبی اکرم ﷺ کے یہ نقوش قدم زمانے کے کارواں کے لئے نہ رہیں تو راستے کی تلاش میں گم شدہ انسانوں کو نشان نہ ملے۔صرف نظری تعلیم راہنمائی نہیں کرتی بلکہ نقوشِ قدم ہوتے ہیں جو راہنمائی کرتے ہیں۔۔۔۔''

کیا تاریخ کو اسوۂ حسنہ کی بنیاد بنایا جائے جس میں صحیح اور غلط سب کچھ شامل ہے اور جو رسول اللہ ﷺ کے اڑھائی سو سال بعد کی لکھی ہوئی ہے؟ اس سے پہلے کا کوئی تحریری ریکارڈ موجود نہیں، صرف زبانی روایات ہیں۔اس بارے میں علامہ مرحوم نے اپنے مذکورہ درس میں فرمایا تھا:

عزیزانِ من! کیا وہ جائے جو قرآن نے کہا ہے۔سیدھی بات ہے کہ جس نے اس ہستی کو اسوہ یا نمونہ قرار دیا ہے، اسی کے کہے کو مانا جائے۔میں ایک مثال دیا کرتا ہوں، اس کو دہرا دوں۔

یہ فائن آرٹ کی کلاس میں جو پینٹنگ کرتے ہیں تو ان کے سامنے ایک Sample یا نمونہ رکھا جاتا ہے کہ اس کے مطابق تصویریں بناؤ۔ وہ سامنے رکھا جاتا ہے، وہ نہ رکھا جائے تو اپنے اپنے تصور کے مطابق سٹوڈنٹس وہ تصویریں بنائیں گے۔اس نمونے کا وہاں ہونا نہایت ضروری ہے۔اللہ تعالیٰ جب کہتا ہے کہ تمہارے لئے رسول ﷺ کی زندگی میں اسوۂ حسنہ ہے تو خدا کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ اسوہ کا جو نمونہ ہے، وہ خود بنا کر دیتا کہ یہ ہیں رسول ﷺ اور یہ ہے قیامت تک کے لئے نمونہ اور اس نمونے کے ہم محافظ ہیں۔عزیزانِ من! رسول اللہ کی حیاتِ طیبہ کے نمایاں خدوخال جتنے ہیں، وہ سارے قرآن کے اندر موجود ہیں۔حضور ﷺ کی سیرت اور اسوۂ حسنہ متعین کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ قرآن کی آیت کو اوپر سرِ فہرست رکھے اور اصول قرار دے اور پھر اس تاریخ میں جائے، اس میں جو واقعات اس کے مطابق ہوں، انہیں سمجھے کہ یہ سچے ہیں اور رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کئے جاسکتے ہیں۔ جو اس آیت کے خلاف ہوں تو کہہ دیا جائے کہ یہ تاریخ کی وضع کردہ چیزیں ہیں، ہم ان کو مسترد کرتے ہیں۔اسی تاریخ میں سے اس طرح سے چُن کے جو آپ قرآن کے تابع سیرت متعین کریں گے، وہ رسول اللہ ﷺ کا اسوۂ حسنہ ہوگا اور یہی قابلِ تقلید ہوگا۔'' (وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم)

غلام احمد پرویزؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

روزوں کا مقصود و منتہیٰ

(پرویز صاحبؒ کا ایک درسِ قرآنِ مجید)

عزیزانِ گرامی قدر! درسِ قرآن کے سلسلہ کے اعتبار سے آج سورۃ النمل کی اگلی آیت سے سلسلۂ کلام شروع ہونا چاہئے تھا لیکن احباب کے تقاضا کے پیشِ نظر آج کا درس روزہ کے موضوع کے لئے مختص کیا جا رہا ہے۔ میں اس درس میں روزوں کے مسائل کے متعلق بات نہیں کروں گا۔ یہ احکام سورۂ بقرہ کی تین چار آیات (2:183-187) میں نہایت جامعیت سے بیان ہوئے ہیں' اس لئے ان کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ ان کے بجائے میں اس امر کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن کریم کی رو سے روزوں کا مقصد کیا ہے؟ ان کی غایت کیا ہے؟ یہ کیوں فرض قرار دیئے گئے ہیں؟

قرآنِ کریم کی ایک خصوصیت (بلکہ جہاں تک میری نگاہ کام کرتی ہے اس کی انفرادیت) یہ بھی ہے کہ یہ جب کوئی حکم دیتا ہے تو اس کے ساتھ اس کی وضاحت بھی کر دیتا ہے کہ یہ حکم کیوں دیا گیا ہے؟ اس کی غرض و غایت کیا ہے؟ اس پر عمل پیرا ہونے کا نتیجہ کیا ہوگا؟ مثلاً اس قسم کی آیات آپ کو کئی ایک مقامات پر ملیں گی:

وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (4:113)

''اے رسولؐ! اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت نازل کی ہے''۔

کتاب کے معنیٰ احکام یا قوانین کے ہیں اور حکمت سے مراد' ان احکام و قوانین کی غرض و غایت۔ یہ دونوں منزل من اللہ ہیں۔ احکام کے سلسلے میں یہ انداز' عظیم حکمتِ بالغہ پر مبنی ہے۔ اگر کسی کو کوئی حکم دیا جائے لیکن اس کی غرض و غایت نہ بتائی جائے۔ یعنی اسے یہ نہ بتایا جائے کہ اسے وہ حکم کیوں دیا جا رہا ہے تو وہ اس کی تعمیل طوعاً و کرہاً کرے گا' بطیب خاطر نہیں کرے گا۔ مستبد حکومتیں اسی طرح احکام صادر اور نافذ کرتی ہیں۔ لوگ ان پر بامرِ مجبوری عمل پیرا ہوتے ہیں اور اسی لئے ان سے گریز کی راہیں تراشتے اور فرار کے طریقے سوچتے رہتے ہیں۔ اگر انہیں بتا دیا جائے کہ ان احکام کی اطاعت سے انہیں کیا حاصل ہوگا۔ اس میں خود ان کے کیا کیا فوائد مضمر ہیں تو وہ ان پر دل و دماغ کی کامل رضامندی سے عمل پیرا ہوں گے اور ان سے منحرف ہونے کا خیال تک بھی دل میں نہ لائیں گے۔ کتاب کے ساتھ حکمت کی وضاحت کی پہلی مصلحت یہ ہے۔

دوسرے یہ کہ جب آپ کو بتا دیا جائے کہ اس حکم کی تعمیل کا نتیجہ یہ ہوگا تو آپ قدم قدم پر اس کا جائزہ لیتے جائیں گے کہ

اس حکم کی صحیح معنوں میں تعمیل ہو رہی ہے یا نہیں۔ اگر اس حکم کی غایت نہ بتائی جائے تو آپ اس پر بلا سوچے سمجھے مکینکی طور پر عمل کرتے رہیں گے اور کبھی یہ نہیں دیکھ سکیں گے کہ اس حکم کی تعمیل صحیح طور پر ہو رہی ہے یا نہیں۔ اور اگر آپ نے اپنے ذہن میں فرض کر لیا کہ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوگا تو آپ بڑی غلط فہمی میں مبتلا رہیں گے اور ہو سکتا ہے کہ آپ کی ساری محنت رائیگاں چلی جائے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ ڈاکٹر مریض کے لئے ایک دوائی تجویز کرتا ہے اور کہتا ہے کہ دوائی دینے کے بعد مریض کا ٹمپریچر لیتے جائیں۔ ہر گھنٹے کے بعد کم از کم ایک ڈگری بخار کم ہو جائے گا۔ آپ مریض کو دوا پلاتے ہیں اور ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق اس کا ٹمپریچر لیتے ہیں۔ اگر بخار کم ہو رہا ہے تو آپ کو اطمینان ہوگا اور آپ علاج جاری رکھیں گے لیکن اگر آپ دیکھیں کہ بخار کم نہیں ہو رہا تو آپ کو از سرِ نو جائزہ لینا ہوگا کہ یا تو مرض کی تشخیص صحیح نہیں ہوئی یا دوائی ٹھیک نہیں ملی اور یا اس کی استعمال میں آپ سے کوئی غلطی ہوئی ہے۔ یہ نہیں ہوگا کہ ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق نتیجہ برآمد نہ ہو اور آپ بدستور وہی دوائی دیتے چلے جائیں۔ اگر آپ ایسا کرتے ہیں تو اس کا جو نتیجہ نکل سکتا ہے ظاہر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جہاں کوئی حکم دیا ہے اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا ہے کہ اس پر عمل پیرا ہونے سے نتیجہ کیا نکلے گا۔ اگر اس کا وہ نتیجہ برآمد نہیں ہوتا تو آپ کو رک کر سوچنا ہوگا کہ اس حکم کی تعمیل میں آپ سے کیا غلطی ہو گئی ہے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ آپ کی محنت رائیگاں نہیں جائے گی بلکہ اس حکم کی غلط تعمیل کے نقصانات سے بھی آپ محفوظ رہیں گے۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (2:183)۔ ''اے جماعتِ مومنین! تم پر صیام فرض قرار دیئے گئے ہیں''۔ یہ ''کتاب'' یعنی حکم ہے۔ اس کی غایات کے متعلق کہا:

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۳﴾ (2:183) وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۸۵﴾ (2:185) اور وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ (2:185)

تَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۳﴾ سے مراد یہ ہے کہ تم میں قوانینِ خداوندی کی اطاعت کے لئے پختگی پیدا ہو جائے اور تم غلط راہوں پر چلنے کے نقصانات سے محفوظ ہو جاؤ۔ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۸۵﴾ سے مقصود یہ ہے کہ تمہاری محنتیں بھرپور نتائج پیدا کر دیں۔ میں ان دو غایات کے متعلق سرِ دست تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ قرآن کریم نے جو غایت الغایات بتائی ہے اس پر مرکوز رہوں گا اور وہ غایۃً الغایات یہ ہے کہ تم خدا کے بتائے ہوئے پروگرام پر عمل کرنے سے اس قابل ہو جاؤ گے کہ دنیا میں خدا کی کبریائی قائم کر سکو۔ یہ ہے روزوں کے متعلق حکم خداوندی کا مقصود و منتہیٰ۔ یعنی خدا کی کبریائی قائم کرنے کے قابل ہو جانا:

وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ (2:185)

سب سے پہلے لفظ ''کبریائی'' کو لیجئے۔ اس کے معنی حکومت اور اقتدار کے ہیں۔ سورہ یونس میں ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام فرعون کے پاس گئے اور اس تک خدا کا پیغام پہنچایا تو اہلِ فرعون نے کہا کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو ہم اس کی غرض و غایت کو خوب پہچانتے ہیں۔ یعنی یہ کہ: وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ ط (10:78) ''تمہارا مقصد یہ ہے کہ اس ملک میں حکومت تمہاری قائم ہو جائے۔ اقتدار تمہارے ہاتھ میں آ جائے''۔ اس

سے لفظ ''کبریائی'' کا مفہوم واضح ہوجاتا ہے۔

جہاں تک خارجی کائنات کا تعلق ہے اس میں خدا کا اقتدار اور اس کی حکمرانی براہِ راست قائم ہے۔ تمام کارگہ کائنات اسی کے قوانین کے مطابق سرگرمِ عمل ہے اور اس میں کسی شے کو مجالِ انحراف نہیں' یارائے سرکشی نہیں: وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۴۵﴾ (45:37) ''کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں کبریائی خدا کی ہے۔ وہ زبردست غلبہ کا مالک ہے لیکن اس کا غلبہ مستبد حکمرانوں کا غلبہ نہیں۔ وہ سراسر حکمت پر مبنی ہے۔'' دوسری جگہ ہے: وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ ؕ (43:84) ''وہی آسمانوں میں بھی صاحبِ اقتدار ہے اور وہی ارض پر بھی صاحبِ اقتدار۔'' (الٰہ کے معنی صاحبِ اقتدار کے ہیں)۔

خارجی کائنات میں تو خدا کا اقتدار از خود قائم ہے۔ لیکن اس کی مشیت کا پروگرام یہ ہے کہ انسانوں کی دنیا میں اس کی کبریائی از خود انسانوں کے ہاتھوں قائم ہو۔ اسی مقصد کے لئے رسول بھیجے جاتے تھے اور رسول کے بعد اس کی ذمہ داری اس کی امت پر عائد ہوتی تھی۔ چنانچہ جب نبی اکرم ﷺ کو منصبِ نبوت پر سرفراز فرمایا گیا تو آپ کو حکم دیا گیا کہ: يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ''اے وہ کہ جس کی آمد سے خزاں دیدہ گلشنِ کائنات بہارِ نو کا مظہر بن جائے گا۔ (الْمُدَّثِّرُ کے یہی معنی ہیں)۔ قُمْ فَاَنْذِرْ ''اٹھ اور نوعِ انسان کو ان کے اپنے وضع کردہ نظام ہائے حیات کی تباہ کاریوں سے آگاہ کردے''۔ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ (74:1-2) ''اور ان نظاموں کی جگہ اس نظام کو قائم کر جس میں کبریائی صرف خدا کے لئے ہو''۔۔۔ یہ تھا منصبِ رسالت۔

دوسرے مقام پر اسی حقیقت کو جن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے ان کی تفصیل بڑی وسعت چاہتی ہے لیکن میں ان میں سے صرف دو ٹکڑوں کو نمایاں طور پر سامنے لاؤں گا۔ وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ ''حکومت صرف اسی کے لئے مختص ہے۔ اس میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہوسکتا''۔ اور اس سے آگے ہے: وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا (17:111) ''لہٰذا تم اس کی کبریائی قائم کرو''۔ اسی اعتبار سے خدا نے اپنے آپ کو ایک جگہ: الْمُتَكَبِّرُ (59:23) کہا ہے۔ کہیں الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ (13:9) اور کہیں: الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ (22:62)۔ ہماری دنیا میں وہ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ کیسے قرار پاتا ہے اس کی وضاحت اس نے یہ کہہ کر کر دی کہ: فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ (40:12) تمہاری دنیا میں حکم صرف اس خدا کا چلنا چاہئے جو ہر قسم کے غلبہ اور کبریائی کا مالک ہے۔

اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا نہ تو ہمارے سامنے آتا ہے۔ نہ وہ تختِ حکومت پر بیٹھتا ہے۔ نہ ہم اس کی آواز سنتے ہیں۔ تو ہمارے معاشرے مین اس کی حکومت کیسے قائم ہوگی؟ اس کے لئے اس نے خود ہی بتا دیا کہ۔۔۔ اس نے ہماری طرف اپنا ضابطۂ احکام بھیج دیا ہے۔ جو حکومت اس ضابطہ کے مطابق قائم ہوگی اسے خدا کی حکومت سے تعبیر کیا جائے گا۔ چنانچہ اس نے واضح الفاظ میں بتا دیا کہ:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (5:44)

جولوگ خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے ان ہی کو کافر کہا جاتا ہے۔

☆☆☆

لیکن خدا کی یہ کبریائی یونہی بیٹھے بٹھائے، وعظ ونصیحت یا تقاریر وخطابات سے قائم نہیں ہوجاتی۔ جب اس کا مقصد دنیا کے ہر نظام کو الٹ کر اس کی جگہ نظامِ خداوندی کو متمکن کرنا ہے تو ظاہر ہے کہ دنیا کی ہر قوم اور ہر حکومت کی طرف سے اس کی مخالفت ہوگی اور ہر مفاد پرست گروہ اس کی مزاحمت کرے گا۔۔۔ان مخالفتوں اور مزاحمتوں کے مقابلے کے لئے میدان جنگ تک میں بھی جانا پڑے گا۔ چنانچہ قرآنِ کریم میں جماعتِ مومنین کی ان جنگوں کی غایت یہ بتائی گئی ہے:

وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ؕ وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ؕ (9:40)

اس سے مقصد یہ ہے کہ ہر غیر خداوندی نظام مغلوب ہوجائے اور خدا کا نظام جسے
غالب ہونے کا حق حاصل ہے، عملاً مسلط ہوجائے۔

اس سے چند ہی آیات پہلے کہا گیا ہے:

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (9:33)

خدا وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ضابطۂ ہدایت اور حق پر مبنی نظام دے کر بھیجا تاکہ یہ نظام انسانوں کے ہر خودساختہ نظام پر غالب آجائے۔ خواہ یہ تبدیلی ان لوگوں پر گراں کیوں نہ گزرے جو خالص حکومتِ خداوندی قائم نہیں کرنا چاہتے۔

یہاں صرف اتنا کہا گیا ہے کہ اس نے رسول کو اس مقصد کے لئے بھیجا۔ لیکن دیگر مقامات پر اس کی وضاحت کردی کہ نظام خداوندی کا قیام تنہا رسول کے ہاتھوں سے عمل میں نہیں آئے گا۔ اس کے لئے جماعتِ مومنین کی معاونت ورفاقت بھی ضروری ہوگی۔ یعنی یہ فریضہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ (48:29) کے ہاتھوں سرانجام پائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے الاعلیٰ اپنے آپ کو کہا تھا لیکن جس جماعتِ مومنین کے ہاتھوں اس کی کبریائی دنیا میں قائم ہوتی ہے۔ اس نے انہیں الْاَعْلَوْنَ کہہ کر پکارا ہے۔ چنانچہ اس نے فرمایا: وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (3:138) ''اگر تم مومن ہو اور مومن رہو گے تو دنیا میں تم ہی سب پر غالب رہو گے''۔ تمہارا قائم کردہ نظام انسانوں کے ہر خودساختہ نظام پر غالب آجائے گا۔ اس غلبہ وتسلط کے لئے قرآن کریم نے اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ کی شرط عائد کردی ہے۔ ''یعنی اگر تم مومن ہوئے تو''۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیسے معلوم ہو کہ ہم مومن ہیں یا نہیں؟ اس کے لئے قرآن نے خود یہ واضح کردیا کہ جولوگ خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہ مومن نہیں، کافر ہیں لہٰذا مومن وہ ہیں جو خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم کرتے ہیں اور اس کی محسوس نشانی یہ ہے کہ وہ دنیا کی ہر قوم پر غالب رہتے ہیں۔ چنانچہ اس نے واضح طور پر کہہ دیا کہ

وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا (4:141)۔

خدا کبھی ایسا نہیں ہونے دے گا کہ غیر خداوندی نظام کی حامل قوم کو جماعتِ مومنین پر غالب آنے دے۔

لہٰذا یہ متعین کرنا بالکل آسان ہو گیا کہ ہم مومن ہیں یا نہیں؟

یہاں ایک عظیم نکتہ سامنے آتا ہے۔ خدا مومنین سے کہتا ہے کہ: اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ۔ لیکن مومن اس کی عطا کردہ اس سرفرازی کے جذبۂ تشکر کے احساس سے بے ساختہ اپنا سر زمین پر رکھ دیتا ہے اور انتہائی انکساری اور خاکساری کے عالم میں کہتا ہے کہ الاعلیٰ میں نہیں۔ سبحن ربی الاعلیٰ۔۔ الاعلیٰ کے شایانِ شان صرف تیری ذات ہے۔ یہ تو تیری عاجز نوازیاں ہیں، جو ہمیں اَلْاَعْلَوْنَ کہہ کر پکارا گیا ہے۔ یہ علو مرتبت ہماری ذاتی نہیں، تیری عطا فرمودہ ہے۔ اگر ہمارا سر تیرے سامنے نہیں جھکتا تو یہ ساری کبریائی جو ہمیں حاصل ہوئی ہے فرعون کی قہرمانیت ہے، مومن کی علوشان نہیں۔ اسی بنا پر قرآن کریم نے حق پر مبنی کبریائی اور باطل پر مبنی کبریائی میں فرق کر کے بتا دیا جب کہا:

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ (7:146)

جو لوگ الحق کے بغیر زمین میں غلبہ اور کبریائی حاصل کر لیتے ہیں، ہم اپنے قوانین کی رو سے انہیں اس مقام سے ہٹا دیں گے اور ان کی جگہ وہ قوم لے لے گی جس کی کبریائی الحق پر مبنی ہو گی۔

ان تصریحات سے واضح ہو گیا کہ روزوں کی غرض و غایت اور مقصود و منتہیٰ کیا تھا؟ ان کا مقصد جماعتِ مومنین کو اس کے لئے تیار کرنا تھا کہ وہ دنیا میں خدا کی کبریائی متمکن کر سکیں۔ لتکبرو اللہ علی ما ھدٰکم۔ صدرِ اول کی جماعتِ مومنین تیرہ برس تک مکہ کی زندگی گذارنے کے بعد مدینہ میں آئی تا کہ یہاں کی نسبتاً مساعد فضا میں نظامِ خداوندی کی بنیاد رکھ دی جائے، لیکن مخالفین نے انہیں یہاں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا اور مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ یہ تھا وہ مقام جب پہلی مرتبہ (2ھ میں) روزے فرض ہوئے اور ابھی سترہ دن کے روزے ہی رکھے گئے تھے کہ انہیں بدر کے میدان میں اترنا پڑا اور وہاں ان روزہ داروں نے خدا کی کبریائی کی پہلی اینٹ رکھ دی۔ آپ نے غور فرمایا کہ روزوں کی غایت کیا تھی؟۔۔۔ لتکبروا اللہ علی ما ھدٰکم۔ خدا کے پروگرام کے مطابق ملک میں اس کی کبریائی قائم کرنا۔ اس زمانے میں مستقل فوج (Standing Army) ہنوز وجود میں نہیں آئی تھی۔ قرآنِ مجید نے تمام مومنین کو مجاہدین (فوج کے سپاہی) قرار دیا تھا۔ ایسا نظر آتا ہے کہ جس طرح آج کل مستقل فوج سے الگ۔۔۔ (Reservists) ہوتے ہیں۔ وہ اپنا اپنا کاروبار کرتے رہتے ہیں لیکن انہیں سال میں ایک آدھ ماہ کے لئے بلا لیا جاتا ہے تا کہ وہ فوجی ٹریننگ کی تجدید کر لیں اور بوقتِ ضرورت فوج کے ہمدوش میدان جنگ میں نبرد آزما ہوں۔ خدا کی کبریائی کا تمکن مومن مجاہدین کا فریضہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ رمضان کا مہینہ انہیں سپاہیانہ زندگی کا خوگر بنانے کے لئے مختص کر دیا گیا تھا۔ حضور نبی اکرم ﷺ سے جب سوال کیا گیا کہ مومن کی زندگی کیا ہے؟ تو فرمایا کہ جب جنگ ہو رہی ہو تو وہ میدان جنگ میں ہو اور جب جنگ نہ ہو رہی ہو تو وہ جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہو۔

آپ نے دیکھا کہ مومن کی زندگی کا مقصود و منتہیٰ دنیا میں خدا کی کبریائی کو متمکن کرنا ہے اور یہی مقصد روزوں کا بتایا گیا ہے۔ اس کے لئے رمضان کے مہینے کی تخصیص کیوں کی گئی' اسے خود خدا نے یہ کہہ کر واضح کر دیا کہ: شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ (2:185) ''رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں نزول قرآن کی ابتداء ہوئی۔'' قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ نے نوع انسان کے لئے نعمت عظمیٰ قرار دیا ہی اور ان سے کہا ہے کہ تم ایسی عظیم متاع کے ملنے پر جشن مسرت مناؤ۔

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ؕ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ (10:58)

اے رسول! ان سے کہہ دو کہ تمہیں یہ متاعِ گراں بہا بلا مزد و معاوضہ مل گئی ہے۔ اس کے ملنے پر تم جشن مناؤ۔ تم جو کچھ بھی دنیا میں جمع کرو' یہ اس سے زیادہ گراں قدر ہے۔

لہٰذا' جسے عیدالفطر کہا جاتا ہے وہ درحقیقت جشنِ نزول قرآن ہے۔ قرآن' خدا کی کبریائی کا ضابطۂ ہدایت ہے اور رمضان کے مہینے کے روزے مجاہدین کو خدا کی کبریائی قائم کرنے اور مستحکم رکھنے کا پروگرام۔ اس پروگرام کے بخیر و خوبی انجام پانے پر جشن مسرت بالکل فطری عمل ہے۔

یہ تھا دین میں روزوں کا مقصد۔ یعنی لتکبروا اللہ علی ما ھدٰکم۔ تاکہ زمین پر خدا کی حکومت قائم کی جائے لیکن جب دین' مذہب میں تبدیل ہو گیا تو قرآن کریم کے یہ الفاظ تو باقی رہ گئے لیکن ان کی غرض و غایت بالکل بدل گئی۔ آپ قرآن کریم کا کوئی سا باترجمہ نسخہ اٹھا کر دیکھیں۔ اس میں ان آیات کا ترجمہ ان الفاظ میں ملے گا۔ ''تاکہ تم خدا کی بڑائی کرو''۔ یعنی دین میں ان الفاظ کا مفہوم' خدا کی کبریائی قائم کرنا تھا۔ مذہب میں ان کا مطلب خدا کی بڑائی بیان کرنا رہ گیا۔ کبریائی قائم کرنے اور بڑائی بیان کرنے میں جو فرق ہے وہ واضح ہے۔ اس ''بڑائی بیان کرنے'' کے حکم کی اطاعت کے متعلق کہا گیا کہ نماز عید میں جو چھ تکبیریں زائد کہی جاتی ہیں' ان سے اس حکم کی تعمیل ہو جاتی ہے۔ اذان۔ نماز اور عیدین کی تکبیریں اپنی اپنی جگہ بجا اور درست' لیکن یہ تکبیریں ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ' یا ایک واقعہ کا اعلان تھیں۔ یعنی اس واقعہ کا اعلان کہ یہاں خدا کی کبریائی قائم ہے۔ اس حقیقت کے وقوع پذیر ہوئے بغیر' اس قسم کے اعلانات صرف چند الفاظ کا اعادہ ہیں۔ حقیقت اور اس کی رسمی ادائیگی کا یہی وہ فرق تھا جس کے احساس سے اقبالؒ کے دردمند دل نے باصد آہ و فغاں کہا تھا کہ ؎

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن ملّا کی اذاں اور، مجاہد کی اذاں اور!
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک جہاں میں کرگس کا جہاں اور ہے، شاہیں کا جہاں اور

یہ مجاہد کی اذان تھی جو دن میں متعدد بار چھت اور مینارہ پر کھڑے ہو کر، دنیا میں اعلان کرتی تھی کہ

اللہ اکبر

کبریائی صرف خدا کے لئے ہی مختص ہے۔ اس میں کوئی اور شریک نہیں ہوسکتا اور اس کے بعد وہ اعلان کرتا تھا کہ

اشھد ان لا الٰہ الا اللہ

میرا یہ اعلان اس حقیقت کی شہادت دیتا ہے کہ خدا کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں۔ آپ نے کبھی اس پر بھی غور فرمایا کہ اس اعلان میں یہ نہیں کہا گیا کہ میں اس بات کا اقرار کرتا ہوں یا اعلان کرتا ہوں۔ کہا یہ گیا کہ میں اس حقیقت کی ''شہادت دیتا ہوں''۔ شہادت اسی کی قابلِ قبول ہوتی ہے جسے اس بات کا ذاتی طور پر علم ہو۔ جو اس کا عینی شاہد ہو۔ اگر کوئی شخص عدالت میں جا کر یہ کہے کہ مجھے اس واقعہ کا ذاتی طور پر تو علم نہیں۔ میرا خیال یہ ہے یا میں نے ایسا سنا ہے تو اس کی شہادت کا قابل قبول ہونا تو درکنار، اسے درخورِ سماعت بھی نہیں سمجھا جاتا۔ لہٰذا، اشھد ان لا الٰہ اسی کا قابلِ قبول ہوگا جو یہ کہے کہ میں اس کا گواہ ہوں کہ یہاں خدا کے سوا کوئی صاحب اقتدار نہیں۔ یہاں خدا کے سوا کسی کی حکومت نہیں۔ یہاں حکمرانی صرف خدا کی ہے۔ جو اس حقیقت کا شاہد نہیں اسے اشھد ان لا الٰہ الا اللہ کہنے کا حق حاصل نہیں۔ یہی وہ شہادت ہے جس کے متعلق خود اللہ تعالیٰ نے فرمادیا کہ شھد اللہ انہ لا الٰہ الا ھو۔ ''خدا اس کی شہادت دیتا ہے کہ اس کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں ہے۔'' وَالْمَلٰٓئِكَةُ ''اور ملائکہ جو اس کے اس اقتدار کو بروئے کار لانے کے لئے مامور ہیں وہ بھی اس کی شہادت دیتے ہیں''۔ انہیں بھی اس کا حق حاصل ہے کہ وہ بھی اس کی شہادت دیں، کیونکہ وہ اس کے عینی شاہد ہیں۔ اس کے بعد ہے: وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآىِٕمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ۔ ''ان کے علاوہ وہ لوگ بھی اس کی شہادت دے سکتے ہیں جنہیں اس کا علم بھی حاصل ہے اور پھر وہ ایسا نظام متشکل کئے ہوئے ہیں جس میں خدا کی میزانِ عدل قائم ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے ذاتی علم اور مشاہدہ کی بناء پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ: لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (3:18) ''خدا کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں اور اس کا اقتدار تنہا قوت پر نہیں، بلکہ قوت کے ساتھ حکمت پر مبنی ہے''۔

آپ نے غور فرمایا کہ۔۔۔ قرآنِ کریم کی رو سے اللہ اکبر کہنے کا حق کسے حاصل ہے؟ رمضان کے روزے جماعتِ مومنین کو اس قابل بنا دینے کے لئے تھے کہ وہ ملک میں خدا کی کبریائی قائم کریں اور پھر ساری دنیا کے سامنے اس کی شہادت دے سکیں۔

یہ ہے عزیزانِ من، میری قرآنی بصیرت کے مطابق صیام کی غرض و غایت اور رمضان کا مقصود و منتہیٰ۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (2:127)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گذشتہ سے پیوستہ

عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے!

اسلام کے مقابل اسلام

قائداعظم کے یومِ پیدائش کی تقریب، منعقدہ 24 دسمبر 1982ء پر پرویزؔ صاحب کا خصوصی درس

اسلام نافذ کرو کا نعرہ:

ہم اس سوال کے سیاسی گوشے سے قطع نظر کرتے ہوئے، اس گوشے کی طرف آتے ہیں کہ جن مذہبی جماعتوں نے مطالبۂ پاکستان کی اس قدر مخالفت کی تھی انہوں نے یہاں ''اسلام نافذ کرنے'' کے سلسلہ میں کیا کیا۔ انہوں نے یہاں آتے ہی یہ مطالبہ شروع کر دیا کہ پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا۔ اس لئے یہاں سب سے پہلا کام اسلام کے نفاذ کا ہونا چاہئے۔ اور یہ کام ہم ہی سرانجام دے سکتے ہیں۔ ان سے کسی نے نہ پوچھا کہ آپ یہاں کون سا اسلام نافذ کرنا چاہتے ہیں؟ وہ اسلام جس کا تصور اقبالؔ اور قائداعظمؔ نے پیش کیا تھا، یا وہ اسلام جسے آپ پیش کرتے تھے۔ یہ ظاہر ہے کہ انہوں نے وہی اسلام نافذ کرنا تھا، جسے یہ وہاں پیش کرتے تھے اور جس سے پاکستان کی جداگانہ مملکت کا جواز ہی باقی نہیں رہتا تھا۔ انہوں نے جب اپنے مطالبہ پر زیادہ زور دیا تو اعتراض یہ ہوا کہ آپ میں تو اس قدر فرقے ہیں جن میں اس قدر باہمی اختلاف ہے، اس لئے یہاں کون سا اسلام نافذ کیا جائے! اگر آپ کوئی متفق علیہ فارمولا متعین کر سکیں تو اس باب میں پیش رفت ہو سکے۔ اس اعتراض کے جواب میں انہوں نے 1951ء میں مختلف فرقوں کے نمائندگان پر مشتمل (31) علماء کی کانفرنس منعقد کی جس میں قانون سازی کے سلسلہ میں حسب ذیل فارمولا پیش کیا گیا:

(1) پرسنل لاز، ہر فرقے کے اپنے اپنے ہوں گے۔ اور

(2) ملک کے قوانین کتاب وسنت کے مطابق مرتب کئے جائیں گے۔

یہ بہت بڑا مقدس فریب تھا جو قوم کو دیا گیا۔ مقصد اس سے یہ تھا کہ ملکی قوانین کا کوئی ضابطہ مرتب ہو ہی نہ سکے۔ تفصیل اس اجمال کی بڑی معنی خیز ہے۔ جہاں تک ''کتاب'' کا تعلق ہے، اس سے مراد قرآن مجید ہے جو سب فرقوں کے نزدیک مسلّم ہے۔ لیکن سنت کی یہ کیفیت نہیں۔ یہی نہیں کہ ہر فرقہ کی سنت الگ الگ ہے۔ سنت کہتے کسے ہیں، اس میں بھی ان کا اختلاف ہے اور شدید اختلاف کانفرنس میں پاس کردہ فارمولا (کتاب وسنت) پر دستخط کرنے والوں میں، سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) اور مولانا محمد اسماعیل سلفی (مرحوم) صدر مرکزی جماعت اہل حدیث، سرفہرست تھے۔ سنت کی (Definition) کے متعلق

ان میں جو بحث چلی، وہ مولانا مرحوم کی طرف سے شائع کردہ کتاب ''جماعتِ اسلامی کا نظریہ حدیث'' میں بالتفصیل درج ہے۔اس کے نمایاں اقتباسات ملاحظہ فرمائیے۔اہل حدیث حضرات کے نزدیک جس کے نمائندہ مولانا سلفی (مرحوم) تھے۔ صحیح احادیث میں جو کچھ آیا ہے، وہ سب کا سب سنت ہے۔اس کے برعکس مودودی صاحب (مرحوم) کے نزدیک:

مودودی صاحب کے نزدیک سنت:

''سنت اس طریق عمل کو کہتے ہیں۔جس کے سکھانے اور جاری کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو مبعوث کیا تھا۔اس سے شخصی زندگی کے وہ طریقے خارج ہیں جو نبی ﷺ نے بہ حیثیت ایک انسان ہونے کے، یا بحیثیت ایک ایسا شخص ہونے کے جو انسانی تاریخ کے خاص دور میں پیدا ہوا تھا، اختیار کئے یہ دونوں چیزیں کبھی ایک ہی عمل میں مخلوط ہوتی ہیں اور ایسی صورت میں یہ فرق اور امتیاز کرنا کہ اس عمل کا کونسا جزو سنت ہے اور کونسا جزو عادت، بغیر اس کے ممکن نہیں ہوتا کہ آدمی اچھی طرح دین کے مزاج کو سمجھ چکا ہو۔۔۔تمدن و معاشرت کے معاملات میں ایک چیز وہ اخلاقی اصول ہیں جن کو زندگی میں جاری کرنے کے لئے نبی ﷺ تشریف لائے تھے اور دوسری چیز وہ عملی صورتیں ہیں جن کو نبی ﷺ نے ان اصولوں کی پیروی کے لئے خود اپنی زندگی میں اختیار کیا۔ یہ عملی صورتیں کچھ تو حضور ﷺ کے شخصی مذاق اور طبیعت کی پسند پر مبنی تھیں۔ کچھ اس ملک کی معاشرت پر جس میں آپؐ پیدا ہوئے تھے اور کچھ اس زمانے کے حالات پر جن میں آپ ﷺ مبعوث ہوئے تھے۔ان میں سے کسی چیز کو بھی تمام اقوام اور تمام لوگوں کے لئے سنت بنا دینا مقصود نہ تھا۔'' (رسائل و مسائل، حصہ اوّل، ص:311، 317)

اسی کتاب میں وہ ص:314 پر لکھتے ہیں:

بعض چیزیں ایسی ہیں جو حضور ﷺ کے اپنے شخصی مزاج اور قومی طرز معاشرت اور آپ کے عہد کے تمدن سے تعلق رکھتی ہیں۔ان کو سنت بنانا نہ تو مقصود تھا نہ اس کی پیروی پر اس دلیل سے اصرار کیا جا سکتا ہے کہ حدیث کی رُو سے اس طرزِ خاص کا لباس نبی ﷺ پہنتے تھے اور نہ شرائع الٰہیہ اس غرض کے لئے آیا کرتی ہیں کہ کسی خاص شخص کے ذاتی مذاق یا کسی قوم کے مخصوص تمدن یا کسی خاص زمانے کے رسم و رواج کو دُنیا بھر کے لئے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سنت بنا دیں، سنت کی اس مخصوص تعریف کو اگر ملحوظ رکھا جائے تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ جو چیزیں اصطلاحِ شرعی میں سنت نہیں ہیں ان کو خواہ مخواہ سنت قرار دے دینا منجملہ ان بدعات کے ہے جن سے نظام دینی میں تحریف واقع ہوتی ہے۔

یعنی اہلِ حدیث حضرات کے نزدیک صحیح حدیث میں جو کچھ آیا ہے وہ سب کا سب سنت رسول اللہ ﷺ کے دائرے میں شامل ہے اور اس سے انکار کرنا کفر ہے۔لیکن مودودی صاحب کے نزدیک صحیح احادیث میں سے وہ باتیں سنت کے دائرے میں داخل نہیں جنہیں نبی اکرم ﷺ نے اپنی بشری حیثیت سے عادتاً اختیار کیا تھا۔اگر کوئی شخص ان باتوں کو بھی سنت

قرار دے تو اس کے متعلق مودودی صاحب کا ارشاد تھا کہ:

میں یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ اس قسم کی چیزوں کو سنت قرار دینا اور پھر ان کے اتباع پر اصرار کرنا ایک سخت قسم کی بدعت اور ایک خطرناک تحریفِ دین ہے جس سے نہایت بُرے نتائج پہلے بھی ظاہر ہوتے رہے ہیں اور آئندہ بھی ظاہر ہونے کا خطرہ ہے۔ (ایضاً، ص:308)

اس سے ذرا پہلے لکھتے ہیں:

''جو امور آپ ﷺ نے عادتاً کئے ہیں انہیں سنت بنا دینا اور تمام دنیا کے انسانوں سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ سب ان عادات کو اختیار کر لیں، اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کا ہرگز یہ منشاء نہ تھا۔ یہ دین میں تحریف ہے۔''
(ایضاص:300)

اس پر اعتراض یہ وارد ہوا کہ احادیث کے مجموعوں میں تو اس کی تصریح کہیں درج نہیں کہ حضور ﷺ نے فلاں بات بہ حیثیت رسول ﷺ فرمائی (یا کی) تھی اور فلاں بات بشری حیثیت سے۔ تو (مودودی صاحب کے اصول کے مطابق) سنت کو متعین کیسے کیا جائے گا۔ اسے کون متعین کرے گا اور اس کے سنت ہونے کی سند کیا ہوگی؟ اس کے جواب میں مودودی (مرحوم) نے کہا کہ ایسے معاملات کا فیصلہ سند اور دلیل کی رُو سے نہیں ہوا کرتا۔ اس کا فیصلہ وہ شخص کر سکتا ہے:

جس نے حدیث کے بیشتر ذخیرہ کا گہرا مطالعہ کر کے احادیث کو پرکھنے کی نظر بہم پہنچائی ہو۔ کثرت مطالعہ اور ممارست سے انسان میں ایک ایسا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے جس سے وہ رسول اللہ ﷺ کا مزاج شناس ہو جاتا ہے۔۔۔ اس کی کیفیت بالکل ایسی ہوتی ہے جیسے ایک پُرانے جوہری کی بصیرت کہ وہ جوہر کی نازک سے نازک خصوصیات تک کو پرکھ لیتی ہے۔۔۔ اس مقام پر پہنچ جانے کے بعد وہ اسناد کا زیادہ محتاج نہیں رہتا۔ وہ اسناد سے مدد ضرور لیتا ہے مگر اس کے فیصلے کا مدار اس پر نہیں ہوتا۔ وہ بسا اوقات ایک غریب، ضعیف، منقطع السند، مطعون فیہ حدیث کو بھی لے لیتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی نظر افتادہ پتھر کے اندر ہیرے کی جوت کو دیکھ لیتی ہے اور بسا اوقات وہ ایک غیر معلل، غیر شاذ، متصل السنہ مقبول حدیث سے بھی اعراض کر جاتا ہے۔ اس لئے کہ اس جامِ زریں میں جو بادۂ معنی بھری ہوئی ہے، وہ اسے طبیعتِ اسلام اور مزاجِ نبوی ﷺ کے مناسب نظر نہیں آتی۔ (تفہیمات، حصہ اوّل، ص:302، ص:324)

مولانا اسماعیل (مرحوم) نے اس پر تنقید کرتے ہوئے لکھا:

اگر ایک جماعت اپنی عقیدت مندی سے کسی اپنے بزرگ یا قائد کو خدا کا مزاج شناس سمجھ لے یا رسول ﷺ کا مزاج شناس تصور کر لے۔ پھر اسے اختیار دے دے کہ اصولِ محدثین کے خلاف جس حدیث کو چاہے قبول کر لے جسے چاہے رد کر دے، یا کوئی عالم یا قائد بلا وجہ کسی موضوع یا مختلق، مرسل یا منقطع حدیث کے

متعلق یہ دعویٰ کر دے کر میں نے اس میں ''ہیرے کی جوت'' دیکھ لی ہے۔ تو یہ مضحکہ انگیز پوزیشن ہمیں یقیناً ناگوار ہے۔ ہم ان شاء اللہ آخری حد تک اس کی مزاحمت کریں گے اور سنتِ رسول ﷺ کو ان ہوائی حملوں سے بچانے کی کوشش کریں گے۔ (جماعت اسلامی کا نظریۂ حدیث، ص:63)

ظاہر ہے کہ جب سنت کی (Definition) میں اختلاف کا یہ عالم ہے۔ تو سنت کا وہ مجموعہ کہاں سے مل سکے گا جسے تمام فرقے متفقہ طور پر سنت تسلیم کرتے ہوں۔ ان حالات میں آپ خود فیصلہ کر لیجئے کہ 1951ء میں (31) علماء نے جو متفق علیہ مطالبہ پیش کیا تھا (کہ ملکی قوانین کتاب وسنت کے مطابق مرتب ہوں) وہ کہاں تک قابل عمل تھا؟ اس کے باوجود، یہ حضرات (مودودی مرحوم سمیت) بیس سال تک یہ مطالبہ پیش کرتے رہے کہ پاکستان میں اسلامی قوانین کتاب وسنت کے مطابق مرتب ہونے چاہئیں۔ تا آنکہ 1970ء میں خود مودودی مرحوم کو اعلان کرنا پڑا:

کتاب وسنت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں ہے جو پبلک لاز کے معاملہ میں حنفیوں، شیعوں اور اہلِ حدیث کے درمیان متفق علیہ ہو۔ (جماعت اسلامی کا ترجمان، ایشیاء، 23 اگست 1970ء)

اس مقام پر آپ کے دل میں یہ خیال اُبھرا ہوگا کہ جب مودودی (مرحوم) نے محسوس کیا کہ یہ سنت کے پیدا کردہ اختلافات ہیں جن کی وجہ سے ایک متفق علیہ ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہوسکتا، تو انہوں نے تجویز کیا ہوگا کہ قانون سازی کا مدار قرآن کو قرار دے دیا جائے۔ کیونکہ اس میں تو کسی کو اختلاف نہیں، لیکن توبہ کیجئے، وہ ایسا کس طرح کر سکتے تھے؟ قرآن کے تو نام سے ان حضرات کو چڑ ہے کیونکہ اس سے ان کا رچایا ہوا سارا کھیل ختم ہوجاتا ہے۔ ان لوگوں کو قرآن کے نام سے کس قدر چڑ ہے اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگائیے۔ دو سال اُدھر کی بات ہے، سعودی عرب نے اپنے ہاں ایک نیا دستور رائج کرنے کا فیصلہ کیا اس کے مسودہ پر تبصرہ کرتے ہوئے، جماعت اسلامی کے ترجمان ایشیاء نے اپنی 13 اپریل 1980ء کی اشاعت کے اداریہ میں لکھا:

''ایک اور بات کی جانب بھی ہم توجہ دلانا ضروری سمجھتے ہیں۔۔۔ خبر ہے کہ شہزادہ نائف نے کہا ہے کہ سعودی عرب کا آئین قرآنِ کریم ہوگا۔ بلاشبہ اس سے ان کا تصورِ قرآن، حدیث سے منقطع نہیں ہے۔ لیکن زیادہ مناسب ہوگا کہ سعودی عرب کا جو بھی دستور بنے اس میں کتاب کے ساتھ سنت کا لفظ ضرور موجود ہو۔''

مقصد اس سے یہی تھا کہ اسلامی مملکت کی جس اسکیم کو ہم یہاں ناکام بنا چکے ہیں۔ وہ کہیں سعودی عرب میں کامیاب نہ ہوجائے۔

بہرحال جب مودودی (مرحوم) نے کہا کہ کتاب وسنت کی رُو سے کوئی متفق علیہ ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہوسکتا تو ان سے پوچھا گیا کہ پھر پاکستان میں اسلامی قوانین کے سلسلہ میں کیا کیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ یہاں فقہ حنفی رائج کر دی جائے۔ یعنی وہ فقہ جس کے متعلق ان کے اپنے نظریات یہ تھے:

1۔ مجتہد خواہ کتنا ہی باکمال ہو، زمان ومکان کے تعینات سے بالکل آزاد نہیں ہوسکتا۔ نہ اُس کی نظر تمام

ازمنہ واحوال پر وسیع ہوسکتی ہے۔ لہٰذا اس کے تمام اجتہادات کا تمام زمانوں میں اور تمام حالات کے مطابق ہونا غیر ممکن ہے۔ (تفہیمات، حصہ دوم، ایڈیشن 1951ء، ص:426)

2۔ یہ سلف کون سے انبیاء تھے جن پر ایمان لانے کی مسلمانوں کو تکلیف دی گئی ہے۔ (ایضاً)

3۔ بزرگانِ سلف کے اجتہادات نہ تو اٹل قانون قرار دیئے جاسکتے ہیں اور نہ سب کے سب دریا برد کر دینے کے لائق ہیں۔ صحیح اور معتدل مسلک یہی ہے کہ ان میں ردوبدل کیا جاسکتا ہے۔

(رسائل ومسائل، جلد دوم، ایڈیشن، ستمبر 1964ء، ص:282)

4۔ دوسرا بنیادی نقص اس مسخ شدہ مذہبیت میں یہ ہے کہ اس میں اسلامی شریعت کو ایک منجمد شاستر بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ (ترجمان القرآن، محرم 1360ھ)

5۔ میرا طریقہ یہ ہے کہ میں ان میں سے کسی کی تحقیق کو حرفِ آخر نہیں سمجھتا۔ اور جب میرا ان کے بیانات سے اطمینان نہیں ہوتا تو خود غور وفکر کر کے رائے قائم کرتا ہوں۔

6۔ میں نہ مسلکِ اہلِ حدیث کو اس کی تمام تفصیلات کے ساتھ صحیح سمجھتا ہوں اور نہ حنفیت یا شافعیت ہی کا پابند ہوں۔ (رسائل ومسائل، حصہ اوّل، ستمبر 1951ء، ایڈیشن، ص:235)

7۔ میرے نزدیک صاحبِ علم آدمی کے لئے تقلید ناجائز اور گناہ، بلکہ اس سے بھی کچھ شدید تر چیز ہے۔

(ایضاً، ص:244)

8۔ ایک صاحبِ عقل انسان کے لئے اس سے زیادہ شرمناک بات کیا ہوسکتی ہے کہ وہ کسی عقیدہ کا معتقد ہو اور اس اعتقاد کے حق میں اس کے پاس اس کے سوا اور کوئی دلیل نہ ہو کہ اس کے باپ دادا بھی یہی عقیدہ رکھتے تھے۔۔۔ کسی چیز کے صحیح یا برحق ہونے کے لئے یہ کوئی دلیل ہی نہیں کہ بزرگوں سے ایسا ہوتا چلا آیا ہے۔ (تنقیحات، پانچواں ایڈیشن، ص:150، 151)

9۔ انسان خواہ سراسر اپنی رائے سے اجتہاد کرے یا کسی الہامی کتاب سے اکتساب کر کے اجتہاد کرے، دونوں صورتوں میں اس کا اجتہاد دنیا کے لئے دائمی قانون اور اٹل قاعدہ نہیں بن سکتا کیونکہ انسانی تعقل اور علم ہمیشہ زمانہ کی قیود سے مقید ہوتا ہے۔ (ایضاً، ص:130)

فقہ کے متعلق مودودی صاحب مرحوم کے ان نظریات کے ساتھ اُن کے اس مطالبہ کو بھی پیشِ نظر رکھئے کہ ملک میں فقہ حنفی رائج کر دی جائے۔

فقہ حنفی کو حنفی (سُنی) فرقہ کے سوا کوئی فرقہ بھی من وعن اسلامی تسلیم نہیں کرتا۔ مذہب سے عدم دلچسپی کی انتہا ہے کہ جب مودودی مرحوم نے یہ تجویز کیا کہ ملک میں فقہ حنفی رائج کر دی جائے تو کسی نے ان سے یہ نہ پوچھا کہ آپ نے کتاب وسنت

کے فارمولا کو اس لئے مسترد قرار دے دیا تھا کہ اس کی رُو سے کوئی ضابطہ قوانین ایسا مرتب نہیں ہو سکے گا جسے تمام فرقے اسلامی تسلیم کر لیں، تو جو ضابطۂ قوانین فقہ حنفی کے مطابق مرتب ہوگا، کیا اُسے تمام فرقے اسلامی تسلیم کر لیں گے؟ کسی نے ان سے یہ نہ پوچھا، حتیٰ کہ ان مذہبی فرقوں نے بھی، جو چھوٹے چھوٹے (فروعی) مسائل کے اختلاف پر حنفیوں سے اُلجھتے رہتے ہیں اور ان کے اختلافی جھگڑے پولیس اور عدالتوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ اور تعجب بالائے تعجب یہ کہ خود حکومت نے بھی اس سوال کو درخورِ اعتناء نہ سمجھا اور فقہ حنفی کو قانون سازی کا مدار تسلیم کر لیا، اس بے اعتنائی کا نتیجہ جلد ہی سامنے آ گیا۔ جب زکوٰۃ سے متعلق قانون پبلک لاء کی حیثیت سے نافذ کیا گیا تو شیعہ حضرات کی طرف سے اس کے خلاف ایسا شدید عملی احتجاج ہوا کہ حکومت کو یہ قانون بدلنا پڑا اور ہر فرقہ کو اجازت دے دی گئی کہ وہ اپنی اپنی فقہ کے مطابق عمل کرے۔ (قرآنی فقہ کے مطابق عمل کرنے کی البتہ اجازت نہیں دی گئی) یہ حشر ہوا پہلے ہی پبلک لاء کا۔ جہاں تک سزاؤں (حدود) سے متعلق نافذ کردہ قوانین کا تعلق ہے خود صدرِ مملکت نے ایک سے زیادہ بار اس کا اعتراف کیا ہے کہ یہ ناممکن العمل ہیں۔ حدود آرڈیننس کے نفاذ کے چند ہی روز بعد صدر مملکت (ضیاء الحق) نے امریکہ کی (C.B.S) کی ٹی وی ٹیم کو ایک انٹرویو دیا تھا جس میں (ان کے اس اعتراض کے جواب میں کہ یہ سزائیں بڑی وحشت ناک ہیں) کہا تھا کہ:

> یہ ٹھیک ہے لیکن میں اس کی وضاحت اس طرح کروں گا۔ اسلام سزا کے بجائے تخویف پر زور دیتا ہے۔ اگر آپ اس فلسفہ پر نگاہ رکھیں گے جو ان سنگین سزاؤں کے پیچھے کارفرما ہے تو آپ دیکھیں گے کہ اُس قانونِ شہادت کی رُو سے جس کا نفاذ کیا جا رہا ہے، ایک فی ہزار مجرموں کو بھی سزائیں نہیں دی جا سکیں گی۔
>
> (پاکستان ٹائمز، 19 فروری 1979ء)

صدرِ مملکت نے، اواخر نومبر 1981ء میں، ہانگ کانگ سے شائع ہونے والے میگزین ایشیاء ویک (Asia week) کو انٹرویو دیا جس میں انہوں نے اس سوال کے جواب میں کہ پاکستان میں شرعی حدود کے متعلق قوانین تو نافذ کر دیئے گئے ہیں لیکن ان کے مطابق کسی کو سزا نہیں مل رہی۔ فرمایا کہ:

> یہ ٹھیک ہے۔ ایسا نہیں کیا جاتا۔ آپ لوگوں کو سنگسار نہیں کر سکتے۔ قرآنی قانون کا فلسفہ یہ ہے کہ تمہارے ہاں ایسی قوت ہونی چاہئے جو لوگوں کو ارتکابِ جرم سے باز رکھ سکے۔ ذرا سوچو کہ کیا یہ ممکن ہے کہ ایسے چار گواہ مل سکیں جو شہادت دیں کہ انہوں نے جنسی اختلاط کے وقت عمل دخول کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا؟ ایسا ناممکن (Impossible) ہے۔ (ایشیاء ویک، بابت 4 دسمبر 1981ء)

آپ نے غور فرمایا کہ یہاں اسلام کو کس طرح ایک عضو معطل بنا کر رکھ دیا گیا ہے؟ اس کے باوجود چرچا کیا جا رہا ہے کہ پاکستان میں اسلام کا احیاء ہو رہا ہے۔ پاکستان کے مخالفین (اور اقبالؒ کی نگہ دوررس کے مطابق) اقوامِ مغرب دونوں کا یہی منشاء تھا۔

نظامِ سرمایہ داری:

ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ مغرب کی نظامِ سرمایہ داری کی علمبردار قوتوں نے ''خدا پرستوں'' (یعنی مسلم اقوام) کو جو دعوتِ اتحاد و تعاون دی تھی تو اس سے کمیونزم کے سیلاب کے سامنے بند باندھنا مقصود تھا۔ مودودی مرحوم نے اسی لئے ان سے کہا تھا کہ تمہارا یہ مقصد اسی صورت میں حاصل ہوسکتا ہے کہ تم مسلم ممالک کے حکمرانوں کے بجائے یہاں کے عوام سے رابطہ قائم کرو۔ یہ رابطہ کس طرح قائم ہو اس کی تفصیل میں جانے کی ہمیں ضرورت نہیں۔ لیکن مودودی (مرحوم) نے اسلام کا جو معاشی نظام پیش کیا وہ اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ انہوں نے نظامِ سرمایہ داری کو عین مطابق اسلام ثابت کرنے کے لئے کس قدر کوشش کی۔ اس نظام کو انہوں نے اپنی کتاب ''مسئلہ ملکیتِ زمین'' میں تفصیل سے پیش کیا ہے۔ اس کے دو ایک اقتباسات ملاحظہ فرمائیے۔ وہ اس میں لکھتے ہیں:

''اسلام نے کسی نوع کی ملکیت پر بھی مقدار اور کمیت کے لحاظ سے کوئی حد نہیں لگائی۔ جائز ذرائع سے جائز چیزوں کی ملکیت جب کہ اس سے تعلق رکھنے والے شرعی حقوق و واجبات ادا کئے جاتے رہیں، بلا حد و نہایت رکھی جاسکتی ہیں۔ روپیہ، پیسہ، جانور، استعمالی اشیاء، مکانات، سواری، غرض کسی چیز کے معاملہ میں بھی قانوناً ملکیت کی مقدار پر کوئی حد نہیں پھر آخر تنہا زرعی جائیداد میں وہ کونسی خصوصیت ہے جس کی بنا پر صرف اس کے معاملہ میں شریعت کا میلان یہ ہو کہ اس کے حقوقِ ملکیت کو مقدار کے لحاظ سے محدود کر دیا جائے۔''

(مسئلہ ملکیتِ زمین، پہلا ایڈیشن، 1950ء، ص:52، 53)

آگے چل کر اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے:

''آخری چیز جو مسلمان مصلحین کی نگاہ میں رہنی ضروری ہے یہ ہے کہ اسلام کے حدود میں رہتے ہوئے ہم کسی نوع کی جائز ملکیتوں پر نہ تو تعداد یا مقدار کے لحاظ سے کوئی پابندی عائد کر سکتے ہیں اور نہ ایسی من مانی قیود لگا سکتے ہیں جو شریعت کے دیئے ہوئے جائز حقوق کو عملاً سلب کر دینے والی ہوں۔ اسلام جس چیز کا آدمی کو پابند کرتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے پاس جو کچھ مال آئے جائز راستے سے آئے۔ جائز طریقے پر استعمال ہو۔ جائز راستوں میں جائے۔ اور خدا اور بندوں کے جو حقوق اس پر عائد کئے گئے ہیں وہ اس میں سے ادا کر دیئے جائیں اس کے بعد جس طرح وہ ہم سے نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنا روپیہ اتنے مکان، اتنا تجارتی کاروبار، اتنا صنعتی کاروبار اتنے مویشی، اتنی موٹریں، اتنی کشتیاں اور اتنی فلاں چیز اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو۔ اسی طرح وہ ہم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہو سکتے ہو۔ پھر جس طرح وہ ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم صرف اسی تجارت یا صنعت یا دوسرے کاروبار کے مالک ہو سکتے ہو جسے تم براہِ راست خود کرو اور جس طرح اس نے دُنیا کے کسی دوسرے معاملہ میں ہم پر یہ قید

نہیں لگائی ہے کہ تم کسی ایسے کام پر حقوقِ ملکیت نہیں رکھ سکتے ہو جس کو تم اُجرت پر یا شرکت کے طریقے پر دوسروں کے ذریعے سے کر رہے ہو، اسی طرح وہ یہ بھی نہیں کہتا کہ زمین کا مالک بھی وہی ہوسکتا ہے جو اس میں خود کاشت کرے اور یہ کہ اُجرت یا شراکت پر کاشت کرانے والوں کو سرے سے زمین پر حقوقِ ملکیت حاصل ہی نہیں ہیں۔ اس قسم کی قانون سازیاں خود مختار لوگ تو کر سکتے ہیں۔ مگر جو خدا اور رسول کے مطیع فرمان ہیں، وہ ایسی باتیں سوچ بھی نہیں سکتے۔''

(ایضاً، ص:72،73)

یہی نظام اس وقت یہاں رائج ہے جسے اسلامی کہنے کے لئے فقہ کی اصطلاحات استعمال کی جاتی ہیں۔ دولت کا انبار درانبار جمع کرنا عین مطابقِ اسلام ہے بشرطیکہ اس میں سے چند پیسے بطور ''زکوٰۃ'' ادا کر دیئے جائیں۔ ربوٰ کا نام (جسے قرآن نے ''خدا اور رسول'' کے خلاف بغاوت قرار دیا ہے)۔ منافع رکھ دیا گیا ہے، خواہ وہ بینکوں میں جمع کردہ رقوم پر ہو، اور خواہ کاروبار میں (Sleeping Partner) کے طور پر جس کے لئے فقہ کی اصطلاح مضاربت اختیار کر لی گئی ہے۔ زمین پر بے حد و نہایت ملکیت جائز ہے بشرطیکہ اس سے ''عُشر'' ادا کر دیا جائے۔ اس قسم کے منافع کو مزارعت کہہ دیا گیا ہے۔ یہ نظام سرمایہ داری کی وہ شدید شکل ہے جس میں اب خود نظامِ سرمایہ داری کی حامل اقوامِ مغرب بھی لچک پیدا کرتی جا رہی ہیں۔ یہاں اسے اسلام کے معاشی نظام کے نام سے رائج اور مستحکم کیا جا رہا ہے۔ یہی اقوامِ مغرب کا منشاء تھا۔

فنڈامینٹل ازم:

ہندو، ہماری مذہبی پیشوائیت اور اقوامِ مغرب کی یہ تشکیلی سازش آہستہ آہستہ زمیں گیر ہوتی چلی گئی۔ لیکن اس کی رفتار بڑی سُست تھی اور اقوامِ مغرب یہ خطرہ محسوس کر رہی تھیں کہ ان کی یہ آہستہ خرامی رفتہ رفتہ جمود کی حد تک نہ پہنچ جائے۔ اس خطرہ کے ازالہ کے لئے انہوں نے ایک نئی ترکیب سوچی۔ اور وہ یہ کہ مسلمانوں کے عہدِ ملوکیت میں وضع شدہ ''اسلام'' کی شراب کہن کو نئی بوتلوں میں اس طرح بند کیا جائے کہ اصلی اور نقلی میں فرق نہ کیا جا سکے۔ اس نئی تحریک کا نام انہوں نے (Funda Mentalism) رکھا جس کے لغوی معنی ''بنیادی اسلام'' کے ہیں۔ اس تحریک کو انہوں نے اس قدر عام کیا ہے کہ مسلم ممالک میں ہی نہیں، یورپ، امریکہ، کینیڈا تک میں ہر جگہ اس کی شاخیں قائم کر دی گئی ہیں، اور وہاں کے نامور مذہبی پیشوا اور قدامت پسند پیشہ وران کے ساتھ منسلک ہیں۔ اس کے لئے انہوں نے روپے کے سیلاب کے بند اس طرح کھول دیئے ہیں کہ سب اس میں بہے چلے جا رہے ہیں۔ جس اسلام کو یہ لوگ پیش کر رہے ہیں وہی ہے جو ہمارے دورِ ملوکیت میں وضع ہوا تھا لیکن اس کے لئے اسلوبِ بیان ماڈرن اختیار کیا جاتا ہے۔ اس سے ''ہمارا وہ طبقہ جو مولویوں سے متنفر تھا ان کی باتیں کان لگا کر سنتا ہے، حالانکہ ان کی باتیں بھی وہی ہوتی ہیں جنہیں مولوی صاحبان پیش کرتے تھے۔ اس طرح یہ تحریک روپے کے زور اور

پراپیگنڈہ کے شور سے کامیاب ہورہی ہے۔خواص کی نگاہوں میں ''ماڈرن ازم'' کی چمک سے اس قدر خیرگی پیدا کی جارہی ہے کہ ان میں حقیقت اور فریب میں تمیز کرنے کی صلاحیت نہیں رہی، اور عوام کے لئے مذہب کی رسمی تقریبات کو اس قدر پُرکشش، بارونق اور مقدس بنایا جارہا ہے کہ وہ سامریت کے اس دامِ ہمرنگِ زمین سے نکل ہی نہیں سکتے۔

یہی تھا وہ نظام جس کی محکمیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' میں ''شعبۂ اسلام'' کے مشیر نے کہا تھا کہ ؎

اس میں کیا شک ہے کہ محکم ہے یہ ابلیسی نظام — پختہ تر اس سے ہوئے خوئے غلامی میں غلام
ہے ازل سے ان غریبوں کے مقدر میں سجود — ان کی فطرت کا تقاضا ہے نمازِ بے قیام
آرزو اوّل تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں — ہو کہیں پیدا تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام!
یہ ہماری سعیٔ پیہم کی کرامت ہے کہ آج — صوفی و مُلّا ملوکیت کے بندے ہیں تمام!
ہے طواف و حج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا؟ — کُند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغِ بے نیام!

(ارمغانِ حجاز، ص:215،216)

اور اس میں تحریکِ پاکستان کے مخالفین اور اقوامِ مغرب واقعی کامیاب ہیں۔

پاکستان کا مقصد:

یاد رکھئے! جس مملکت کے قیام کا تصور اقبالؒ نے دیا تھا اور جس کے لئے قائداعظمؒ کی سعیِ پیہم کے تصدق ایک خطۂ زمین حاصل ہوا تھا، اسے اپنی مقصدیت کے اعتبار سے اسلامی مملکت بننا تھا۔ وہ مقصدیت یہ تھی کہ اس میں:

1۔حقِ حکومت کسی انسان یا انسانوں کے گروہ کو حاصل نہیں ہوگا۔حکمرانی صرف کتابِ اللہ (قرآن) کی ہوگی۔

2۔اس میں غلط اور صحیح، جائز اور ناجائز، اسلامی اور غیر اسلامی کی سند اور اتھارٹی قرآن مجید ہوگا۔

3۔اس میں کسی کو نہ کسی قسم کا خوف ہوگا، نہ حزن۔خوف ہوگا تو صرف قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کے مضرت رساں نتائج کا جن کا اطلاق ہر ایک پر یکساں ہوگا۔

4۔اس میں نہ کوئی فرد رات کو بھوکا سو سکے گا۔نہ کسی کی کوئی ضرورت رُکی رہے گی۔

5۔اس میں امیر اور غریب، محتاج وغنی، حاکم ومحکوم کی تمیز نہیں ہوگی۔تمام انسان یکساں واجب التکریم ہوں گے اور تذلیل وتوہینِ آدمیت سنگین ترین جرم ہوگا۔

6۔اس میں وہ نظامِ سرمایہ داری باقی رہے گا، نہ مذہبی پیشوائیت کا وجود۔اُمت کے باہمی مشورہ سے نظامِ حکومت قائم ہوگا اور وہ نظام قرآن مجید میں متعین کردہ غیر متبدل حدود کے اندر رہتے ہوئے، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قواعد و ضوابط خود مرتب کرے گا۔انہی کو احکامِ شریعت کہا جائے گا۔

7۔اس میں ساری اُمت، اُمتِ واحدہ ہوگی جس میں کسی قسم کا تفرقہ نہیں ہوگا۔

یہ تھا وہ نظام جسے قائم کرنے کے لئے پاکستان کا خطۂ زمین حاصل کیا گیا تھا۔اس کے مخالفین کی انتہائی کوشش تھی کہ اوّل تو یہ خطۂ زمین ہی حاصل نہ ہو، اور اگر حاصل ہو بھی جائے تو اس میں یہ نظام قائم نہ ہو سکے (جسے الدین کہا جاتا ہے)۔اس کے بجائے اس مذہب کا دور دورہ ہو جس سے انسان نہ دین کا رہتا ہے، نہ دُنیا کا، اقبالؒ کے الفاظ میں ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ ؎

وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ وخدا مست　　یہ مذہبِ مُلّا و جمادات و نباتات

قائداعظمؒ نے تحریکِ پاکستان کے دوران کہا تھا:

''ہماری حفاظت، ہماری نجات اور عزت وآبرو (کے تحفظ کا واحد ذریعہ) پاکستان ہے۔اگر ہم اس جدوجہد میں ناکام رہ گئے تو ہم تو تباہ ہو ہی جائیں گے لیکن اس کے ساتھ ہی اس برصغیر میں نہ مسلمانوں کا وجود باقی رہے گا۔نہ اسلام کا نام ونشان۔''

(تقاریر، جلد دوم، ص:255)

اگر قائداعظمؒ زندہ ہوتے تو وہ دیکھتے کہ پاکستان مل جانے کے بعد بھی اس اسلام پر کیا بیت رہی ہے جس کے احیاء کے لئے انہوں نے پاکستان لے کر دیا تھا۔

بہرحال، ہماری انتہائی بدقسمتی ہے کہ ہم اس میں ناکام رہ گئے اور پاکستان کے مخالفین کامیاب ہو گئے۔یہ بدقسمتی ہماری ہی نہیں۔پوری کی پوری انسانیت کی بدقسمتی ہے کیونکہ پاکستان نے اس نظام کی تجربہ گاہ بننا تھا جس سے نوعِ انسان نے اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنا تھا۔اس اعتبار سے ہم اپنی بدنصیبی کے بھی ذمہ دار اور مجرم ہیں اور عالمگیر انسانیت کی بدنصیبی کے بھی ذمہ دار اور مجرم، ہزار سال کے بعد یہ نادرِ روزگار موقعہ ہمیں میسر آیا تھا ہم نے اسے بُری طرح کھو دیا۔اے وائے ما!!

جبیں را پیش غیر اللہ سودیم　　چو گبراں در حضورِ او سرودیم

ننالم از کسے، می نالم از خویش　　کہ ما شایانِ شانِ تو نبودیم

(ارمغانِ حجاز، ص:51)

مجھ سے اکثر تقاضا کیا جاتا ہے کہ میں اقبالؒ کے فارسی اشعار کا ترجمہ بھی پیش کر دیا کروں۔میں ان اشعار کا ترجمہ کیا کروں؟ یہ تو اپنی لاش کے سرہانے کھڑے ہو کر اپنا ماتم کرنا ہے۔ہر چند کہ ماحول کی افسردگی طبیعت کو اس طرف آنے نہیں دیتی لیکن غالب نے اس مفہوم کو اپنے شوخ وشنگ انداز میں جس طرح ادا کیا ہے اس سے بات سمجھ میں آجائے گی اُس نے کہا ہے:

چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسد　　آپ کی صورت تو دیکھا چاہئے!

غافل! ان مہ طلعتوں کے واسطے چاہنے والا بھی اچھا چاہئے

جن رفعتوں اور عظمتوں کا آئینہ دار وہ اسلام تھا جس کے لیے ہمیں یہ خطہ زمین عطا ہوا تھا اس اسلام کو نافذ کرنے والے انسان بھی اتنے ہی بلند اور عظیم ہونے چاہئیں تھے۔ ہمارے جیسے پست قامت ان بلندیوں تک پہنچنے کے قابل نہیں تھے، اس لیے ہم اس نعمت کبریٰ کے اہل نہیں قرار پائے۔ جو تیشۂ فرہاد اُٹھانے کی ہمت نہ رکھتا ہو، اسے جوئے شیر کیسے مل سکتی ہے؟ ہمیں اپنے اندر یہ ہمت پیدا کرنی چاہئے تھی۔ قرآن کریم نے ''اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ'' (تم سب پر غالب آجاؤ گے) کے لئے اِنْ کُنْتُمْ مُؤْمِنِیْنَ۔ (اگر تم مومن ہوتے) کی شرط عائد کی تھی۔ ہم نے اس شرط کو پورا نہ کیا تو اس مقام تک پہنچ نہ سکے۔

مجھے تو کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کی تاریخ دُہرائی جارہی ہے۔ فرعون کی غلامی میں وہ ضعف و بیچارگی کی انتہا تک پہنچ گئے تو مشیتِ خداوندی نے اُن کی حالت پر رحم کھایا اور چاہا کہ انہیں تمکن فی الارض حاصل ہوجائے۔ (5-38:6)۔ اس کے لئے انہیں ایک خطہ زمین عطا کر دیا گیا۔ (قرآن کے الفاظ میں) اسے ان کے نام لکھ دیا۔ (5:21) لیکن جب وہ اس کے اہل ثابت نہ ہوئے تو تقدیر امم کے اٹل قانون کی رُو سے فیصلہ ہوا کہ: فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۚ يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ (5:26)۔ جس زمین کا پٹہ ان کے نام لکھ دیا گیا تھا، اس سے انہیں محروم کر دیا اور کہہ دیا کہ وہ چالیس سال تک خانہ بدوشوں کی طرح صحرا نوردی کریں اور اپنے اندر تمکن فی الارض کی صلاحیت پیدا کریں۔ خدا کرے کہ ہمارے جرائم کی سزا ابدی محرومی نہ ہو۔ وقتی ہو اور جس طرح بنی اسرائیل کی اُس نسل کے بعد آنے والے مؤرخ نے اُسی سرزمین میں سطوتِ داؤدی اور شوکتِ سلیمانی کا نظارہ کیا تھا، ہمارا آنے والا مورخ بھی اُس نظام کی جنت آفرینیوں کا نظارہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لے جس کے لئے یہ خطۂ زمین ہمیں عطا کیا گیا تھا۔ اُس کی رحمتِ بے پایاں نے، جنت سے نکلے ہوئے آدم کو جنت کی بازیابی کا وعدہ بھی تو دلایا تھا۔ لیکن یہ جنت مفت میں نہیں مل جانی تھی۔ اس کے لئے فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ (2:38) کی شرط لازم تھی۔ اس طرح حاصل کردہ جنت کو کوئی چھین نہیں سکتا۔

آں بہشتے کہ خدائے بتو بخشد ہمہ ہیچ تا جزائے عملِ تست، چناں چیزے ہست

مفہوم: وہ بہشت جو تمہیں (بھیک میں) بخشی گئی ہو، کسی کام کی نہیں۔ وہ جنت جو تمہاری جدوجہد اور محنت کے نتیجے میں وجود میں آئے، اس کی کیا بات ہے۔

ہمیں یہ خطۂ زمین ملا ہی اس لیے تھا کہ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ (10:14)۔ ''ہم دیکھیں کہ تم کس قسم کے کام کرتے ہو؟'' ہم نے جس قسم کے کام کئے اُسی قسم کا نتیجہ ہمارے سامنے آگیا۔ یہاں تو

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی

لیکن مجھے تو داستانِ بنی اسرائیل کو اپنے حال پر منطبق کرتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔ ان کے متعلق قرآن نے بتایا ہے کہ

اس کی تمکن فی الارض سے عارضی محرومی کے بعد، نئی نسل کے نوجوان (حضرت) موسیٰؑ پر ایمان لے آئے اور ان کے جوشِ کردار نے مخالفت کے ہر بند کو توڑ کر تمکن حاصل کر لیا۔ لیکن ہماری نئی نسل کو تو اس مقام پر پہنچا دیا گیا ہے جہاں وہ اسلام کے نام تک سے متنفر ہو رہی ہے۔ اس کا اگلا قدم سیکولرزم ہوگا۔ اُس وقت بھارت کا ہندو مسلمانوں کی وہ تمام جماعتیں جنہوں نے مطالبہ پاکستان کی مخالفت کی تھی اور اقوامِ مغرب اپنی اس کامیابی پر جشنِ مسرت منائیں گی کہ:

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

مفہوم: بلا سر پر آ گئی تھی لیکن شکر ہے ٹل گئی!

اس سے اُن کے دل پر کیا گزرے گی جنہوں نے اس خطۂ زمین میں قرآنی نظام کا خواب دیکھا تھا، اس کی بابت مت پوچھئے۔ خدا عدو کو بھی یہ خواب بد نہ دکھلائے!

لیکن اس کے باوجود، جب تک میرے دم میں دم ہے مَیں قرآن کی آواز بلند کئے جاؤں گا کہ میرے سامنے اُس کا یہ وعدہ موجود ہے جو کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا، کہ اس نظام کو دُنیا کے ہر نظام پر غالب آ کر رہنا ہے۔ یہاں نہ سہی کہیں اور سہی۔

1۔ محفلِ ما بے مے و بے ساقی است — سازِ قرآں را نوا ہا باقی است

2۔ زخمۂ ما بے اثر افتد اگر — آسماں دارد ہزاراں زخمہ در

3۔ حق اگر از پیشِ ما بردارد ش — پیشِ قومے دیگرے بگذاردش

4۔ ترسم از روزے کہ محرومش کنند — آتشِ خود بر دلِ دیگر زنند

(جاوید نامہ، ص:91)

ترجمہ:

1۔ ہماری محفل شراب اور ساقی کے بغیر ہے، مگر قرآن کے ساز کے نغمے اپنی جگہ برقرار ہیں۔

2۔ اگر ہماری مضراب میں کوئی اثر نہیں رہا تو آسمان کے پاس ہزاروں اور ساز ندے موجود ہیں۔

3۔ اگر اللہ تعالیٰ اسے (قرآن کو) ہمارے سامنے سے اٹھا لے تو وہ اسے کسی اور قوم کے سامنے رکھ دے گا۔

4۔ میں اس دن سے ڈرتا ہوں کہ مسلمان کو قرآن سے محروم نہ کر دیا جائے۔ اور مولا کریم اپنے عشق کی آگ کسی اور کے دل پر نہ ڈال دے۔

قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ نے تمام نوعِ انسان کے لئے قیامت تک ضابطۂ حیات قرار دیا ہے، اس لئے اس کا نظام نہ کسی خاص خطۂ زمین سے وابستہ ہے۔ نہ کسی خاص قوم تک محدود، اور نہ کسی خاص زمانے سے مختص۔ جو قوم جس ملک اور جس زمانے میں بھی اس کے حقائق پر علم و بصیرت اور عقل و فکر کی رُو سے غور کر کے انہیں اختیار کر لے گی وہ اس سے فیضیاب ہو جائے گی۔

مذہب پرست قومیں جو اپنی خوش فہمیوں میں مست اور توہم پرستیوں میں مطمئن رہتی ہیں ان کے حصے میں یہ سعادت نہیں آ سکے گی۔ دانش ورانِ مغرب، اپنے موجودہ نظامِ حیات سے تنگ آ کر ایک نئی دُنیا اور اس میں ایک جدید نظام کی تلاش میں ہیں۔

ایک ایسی دنیا جس میں نہ کرۂ ارض پر کھینچی ہوئی ممالک کی لکیریں ہوں اور نہ ہی قوموں کے خود وضع کردہ حدود۔ یہ وہ دنیا ہوگی جس میں انسان جہاں جی چاہے آزادانہ چلے پھرے، رہے سہے، اور ہر جگہ یکساں شرائط پر اپنے لئے مسرت حاصل کر سکے۔ سیاسی طور پر اس سے مُراد ساری دنیا کی واحد حکومت ہوگی۔ جو جمہوری طور پر تمام انسانوں کے باہمی مشورہ سے اپنا کاروبار سرانجام دے گی۔ ہم اپنی روح کے مذہبی نشیمن میں کسی اسی قسم کی حسین دُنیا کا تصور محسوس کرتے ہیں جس میں کامل ہم آہنگی اور یکجہتی ہو۔

(Beyond the welfare state, By. Gunner Myrdal)

یہ دُنیا ایک ایسے مذہب کی رہین منت ہوگی:

''جو انسان کی ارتقائی منازل کا ساتھ دے گا۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوگی کہ وہ عالمگیر ہوگا اور منتشر انسانیت کو ایک وحدت میں منسلک کر دے گا۔ جو مشرق و مغرب کے تمام مذاہب کی تعلیم کا مہیمن ہوگا۔ وہ عقل و فکر پر مبنی ایسا قابلِ عمل ضابطۂ اخلاق دے گا جو علومِ سائنس سے ہم آہنگ ہو۔ وہ انسان کو اس قابل بنا دے گا کہ وہ خارجی کائنات اور خود اپنی ذات کے ساتھ ہم آہنگ رہ سکے۔ اُسی کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ نوعِ انسان کا مذہب بن سکے۔''

(The Sane Society; by Erich Fromm)

ہم نے اس مقام پر دانش ورانِ مغرب میں سے صرف دو ایک کے خیالات پیش کئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ سب اپنی نیشنلزم کے ہاتھوں نالاں ہیں کہ دُنیا میں جنگوں کے لامتناہی سلسلہ کا بنیادی سبب یہی ہے۔ وہ اپنے ہاں کی جمہوریت سے تنگ آ چکے ہیں کہ ان کے نزدیک یہ بھی ملوکیت ہی کا پرتو ہے۔ مغربی سرمایہ پرست قومیں اپنے معاشی نظام کو عالمگیر تباہی کا موجب قرار دیتی ہیں۔ اس کے برعکس روس اور چین کی سوشلزم بری طرح ناکام ثابت ہو رہی ہے اس حصہ لا کے بعد جب وہ الا (مثبت نظام) کے متعلق سوچیں گے تو وہ قرآن کے سوا کہیں نہیں ملے گا۔ اس طرح ؎

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے　　یہ جہاں معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

والسلام

آصف جلیل

قندِ مکرّر

محمد سلمان غانم سے ایک مکالمہ

محترم بشیر احمد عابد کی دعوت پر کویت کے قرآنی سکالر محترم محمد سلمان غانم کراچی تشریف لائے تھے۔ اپنے دس روزہ قیام کے دوران ان کی ملاقات بزموں کے نمائندگان اور اراکین سے ہوئی۔ اس کے علاوہ انہوں نے تین بزموں کا دورہ بھی کیا۔ آصف جلیل صاحب نے طلوع اسلام کے لئے ان کا خصوصی انٹرویو لیا۔

سوال: آپ اپنی زندگی کے بارے میں بتایئے۔

جواب: میں 1945ء میں پیدا ہوا۔ 1971ء میں کویت یونیورسٹی سے اقتصادیات میں بیچلرز ڈگری حاصل کی۔ اسی سال یونیورسٹی میں پڑھانا شروع کیا۔ 1975ء میں انگلینڈ سے اقتصادیات میں ماسٹرز کی ڈگری حاصل کی۔ تقریباً دس سال تک کویت یونیورسٹی میں پڑھایا۔ اس کے علاوہ اقتصادیات، پلاننگ اور ترقی کے بارے میں ریسرچ سے متعلق مختلف عہدوں پر کام کیا۔ پانچ سال تک مجلہ الاتحاد کا ایڈیٹر رہا۔ اس کے علاوہ مجلہ العامل میں مضامین لکھتا رہا۔ میری تقریباً ۱۵ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

وہ کیا اسباب تھے جن کی وجہ سے آپ نے مروجہ عقائد کو چھوڑ کر قرآن کریم کی طرف رجوع کیا؟

جب میں چھوٹا تھا تو گھر میں کوئی کتاب نہیں تھی۔ میں نے پڑھنے اور لکھنے کے لئے قرآن کریم سے مدد لی۔ جب میں بارہ سال کا ہوا تو مذہب کے حوالے سے میرے ذہن میں بہت سے سوالات پیدا ہوتے تھے لیکن میں ان کا اظہار نہیں کر سکتا تھا۔ میرے والد صاحب امام مسجد تھے اور وہ زبردستی نماز پڑھنے کے لئے کہتے تھے لیکن میرا ذہن یہ کہتا تھا کہ یہ وہ صلوٰۃ نہیں جو حضور ﷺ کے زمانے میں ادا کی جاتی تھی۔ جب میں یونیورسٹی میں داخل ہوا تو میں نے مارکسی نظریات پر روسی مصنفوں کی کتابیں پڑھنا شروع کیں اور ان سے متاثر ہوا۔ اس کے بعد میں انگلینڈ ماسٹرز کرنے گیا اور پھر شادی کر لی۔ اس دوران میں اقتصادیات پر تو لکھتا رہا لیکن قرآن کریم کو بغور پڑھنے کا موقع مجھے ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد ملا۔ میں نے بہت سی کتب تفاسیر پڑھیں لیکن مجھے بے حد افسوس ہوا کہ قرآن کریم کو نہایت غلط طریقے سے پیش کیا جاتا ہے۔ جو کچھ قرآن کریم میں کہا گیا ہے، اس کے بالکل برعکس بتایا جاتا ہے۔ بہت سے الفاظ کے وہ معنی بیان کیے جاتے ہیں جو عربی

زبان کی رو سے غلط ہیں۔ بہت سی باتوں کا قرآن کریم میں ذکر ہے لیکن مُلا انہیں چھپاتے ہیں۔ مجھے قرآن کریم کے مطالعہ سے اشتراکیت، سرمایہ داری کی نسبت زیادہ قرآنی تصورات کے قریب لگتی تھی، لیکن تمام مذہبی ملا اس کو کفر والحاد سے تعبیر کر کے یکسر رد کر دیتے ہیں اور سرمایہ داری نظام جو انسانیت کا سب سے بڑا دشمن ہے، اس کی حمایت کرتے ہیں۔ میں نے جس طرح قرآن کے احکام کو سمجھا انہیں تحریر میں لے آیا۔

سوال: آپ کی تحریروں پر کس طرح کا ردعمل سامنے آیا۔

میں یونیورسٹی میں پڑھانے کے دوران مجلہ الاتحاد اور مجلہ العالم میں لکھتا رہتا تھا۔ ان کا موضوع اقتصادیات اور اشتراکیت ہوتی تھی۔ ان پر کسی کو اعتراض نہیں ہوتا تھا۔ لیکن جب میں نے اسلام کے بارے میں قرآنی نقطہ نظر پیش کیا اور اس موضوع پر میری پہلی کتاب "اللہ والجماعۃ" (اللہ اور جماعت) کے عنوان سے کویت میں شائع ہوئی تو اس پر شدید ردعمل ہوا۔ اس پر وزارت اعلام کی طرف سے مقدمہ دائر کر دیا گیا۔ عدالت نے کتاب کو ضبط کرنے کا حکم دیا لیکن مجھے کسی قسم کی سزا نہ دی گئی۔ اس پر مذہبی لوگوں نے میرے خلاف جھوٹا پراپیگنڈا کیا۔ اس وجہ سے ناشروں نے میری کتابوں کو چھاپنے سے معذرت کر لی کیونکہ وہ کسی قسم کی مشکلات میں نہیں پڑنا چاہتے تھے۔ اس کے بعد میری تمام کتابیں بیروت سے چھپتی رہیں اور سب پر نہ صرف کویت بلکہ زیادہ تر عرب ممالک میں پابندی لگتی رہی۔ میں اکثر لبنان جاتا رہتا ہوں اور اپنے ساتھ اپنی کتب لے آتا ہوں اور اپنے قریبی لوگوں کو دیتا ہوں۔ اسی طرح جب میں تدریس کے دوران طلبہ کو کورس کے علاوہ اپنے نقطہ نظر سے آگاہ کیا کرتا تھا تو اسے اچھا نہ سمجھا گیا اور مجھے دوسرا کام دے دیا۔ میں نے جہاں بھی کام کیا وہاں پر کام کرنے والوں کو میرے نظریات کا علم ہوتا تو وہ میری شکایت کر دیتے۔ اسی طرح مجھے مختلف اداروں میں ٹرانسفر کیا جاتا رہا۔ ریٹائر ہونے کے بعد میں نے بغیر کسی دباؤ کے قرآن کے موضوعات پر لکھنا شروع کیا۔

سوال: روایات کے بارے میں آپ کا نظریہ کیا ہے؟

مروجہ عقائد کی بنیاد جھوٹی اور اسرائیلی روایات پر ہے۔ میں نے سنیوں اور شیعوں کی تمام کتب روایات پڑھی ہیں۔ یہ سب یا تو روایات کو قرآن کریم کے برابر سمجھتے ہیں یا وحی کا درجہ دیتے ہیں۔ میرے نزدیک قرآن کریم کو فوقیت حاصل ہے اور حدیث دوسرے درجے پر آتی ہے۔ وہی احادیث قبول کرنی چاہیے جو قرآن کے خلاف نہ ہوں اور نہ ہی عقل کے۔ میں نے اپنی کتب میں ایسی ہی احادیث کا حوالہ دیا ہے جو قرآن کریم کے مطابق ہیں۔

سوال: اسلام کے سیاسی نظام کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

ان دنوں میں ایک کتاب لکھنے کی تیاری کر رہا ہوں جس میں اسلامی مملکت کے بارے میں اپنا نظریہ پیش کروں گا۔ یہ نظریہ آئندہ آنے والوں کو راہ دکھائے گا جسے وقت کے مطابق ڈھالا جا سکے۔ ظاہر ہے کہ تبدیلی فوری طور پر نہیں آ سکتی۔ قرآن کریم کے نظام میں وسعت ہے جسے زمانے کے بدلتے حالات کے مطابق ڈھالا جا سکتا ہے۔

سوال: اسلام کا معاشی نظام کیسا ہے؟

چونکہ یہ میرا شعبہ ہے اس کے بارے میں نے بہت تفصیل سے لکھا ہے۔ چند خاص باتوں کا میں ذکر کر دیتا ہوں۔ سب سے پہلے یہ کہ اسلام میں سرمایہ داری نظام کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ سرمایہ جمع ہی اس صورت میں ہوتا ہے جب دوسرے کی محنت کے ماحصل پر ڈاکہ ڈالا جائے۔ معاوضہ صرف محنت کا ہے۔ جو زیادہ کام کرے اسے زیادہ ملے گا۔ تمام ذرائع پیداوار زمین سے حاصل ہوتے ہیں۔ تمام انسانوں کا ان میں مساوی حصہ ہے۔ سرمایہ دار مزدوروں کو جو معاوضہ دیتا ہے وہ اس پیداوار سے بہت کم ہوتا ہے جس کے لئے اس نے محنت کی ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی مزدور ہر روز ۵۰۰ روپے کا سامان بناتا ہے تو اسے ۲۰۰ روپے معاوضہ ملتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مل مالک نے اس کے ۳۰۰ روپے مار لئے ہیں۔ اسی طرح زمین کی پیداوار صرف اس کی ہے جس نے محنت کی ہے۔ کوئی شخص صرف اتنی زمین رکھ سکتا ہے جتنی پر وہ خود کاشت کر سکتا ہے۔ اگر رقبہ بڑا ہو تو اس پر کام کرنے والوں کا پیداوار میں برابر کا حصہ ہوگا۔ غرض یہ کہ کوئی ایسا ذریعہء آمدنی حلال نہیں ہے جس میں محنت نہ کی گئی ہو۔ جو کسی وجہ سے کام نہیں کر سکتے ان کا حق اس پیداوار میں اس لئے ہے کہ ذرائع پیداوار میں سب شریک ہیں۔ ملا اسے اشتراکیت سے تعبیر کرتے ہیں، حالانکہ اسلام اشتراکیت سے بہت پہلے آیا تھا۔ ربوٰ کی تمام شکلوں کو جائز قرار دیا جاتا ہے سوائے ایک شکل کے کہ قرض پر کچھ زیادہ لیا جائے۔ لیکن ربوٰ دراصل ہر وہ آمدنی ہے جو بغیر محنت کے حاصل ہو۔

سوال: قرآن کریم کو سمجھنے کا صحیح طریقہ کیا ہے؟

قرآن کریم کو سمجھنے کے لئے ہمیں تمام قدیم تفاسیر کو چھوڑ دینا چاہیے کیونکہ یہ جس دور میں لکھی گئی ہیں وہ علم کے لحاظ سے بہت پیچھے تھا۔ جنہوں نے وہ تفاسیر لکھیں ان کے علم کی سطح اتنی ہی تھی۔ بے شمار سائنسی حقائق ابھی سامنے نہیں آئے تھے۔ قرآن کریم ہر دور کے لئے ہے۔ عام آدمی کے لئے اس میں جو باتیں ہیں وہ عام فہم ہیں۔ لیکن جو قرآن کریم کا گہرائی سے مطالعہ کرنا چاہتا ہو، اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کی نظر تمام عصری علوم پر بھی ہو۔ اس کے علاوہ قرآن کریم اپنی بات کی تشریح خود کرتا ہے۔ اسی لئے ایک ہی موضوع پر مختلف انداز سے آیات آئی ہیں۔ اس کے علاوہ عربی زبان کے وہ معانی لینے چاہیے جو اس وقت کے عرب لیتے تھے۔ بے شمار الفاظ ایسے ہیں جن کے معانی میں تحریف کر دی گئی ہے۔ یہ سب اس لئے کیا گیا تا کہ دور ملوکیت کے حکمرانوں کو خوش کیا جائے۔

سوال: یہاں آ کر آپ کو کیسا لگا؟

مجھے آپ سب سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے۔ آپ کے ساتھیوں نے میری باتیں دلچسپی سے سنیں اور سوالات کیے۔ کراچی شہر میں مومبای کی نسبت بلند عمارتیں کم نظر آتی ہیں لیکن یہاں کی سڑکیں بہت وسیع ہیں۔ آخر میں میں نے غانم صاحب کا شکریہ ادا کیا اور خوشی کا اظہار کیا کہ ذاتی طور پر مجھے ان سے ملنے کا جو اشتیاق تھا اس کی تکمیل ہوئی۔

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
www.azharabbas.com
khawaja.azharabbas@gmail.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تحریکِ طلوعِ اسلام اور
جماعتِ اسلامی کے درمیان فکری قربتیں اور فاصلے
(میرا نکتۂ نظر)

ہمیں مولانا مودودی مرحوم سے گہری محبت ہے۔ ہم ستمبر 1947ء میں دہلی میں فسادات کے بعد مجبوراً لاہور منتقل ہوئے۔ ہم 19 ستمبر 1947ء کو پاکستان میں داخل ہوئے اور 22 یا 23 ستمبر کو مولانا کے پاس حاضر ہوئے۔ یہ ہماری مولانا سے پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ ہم نے ایک تفصیلی مضمون اس ملاقات کی بابت تحریر کیا تھا۔ وہ یا تو رسالہ طلوعِ اسلام میں طبع ہو گیا ہے یا عنقریب اس کو طبع کرا دیا جائے گا۔

دین کا تصور، دین اور مذہب کے درمیان فرق دین کی اہمیت اور مذہب کی مذمت کے نظریات سب سے پہلے علامہ اقبال نے پیش کئے تھے۔ اس کا شرف ان کو جاتا ہے۔ علامہ مرحوم کی اہمیت اور ان کے بلند مرتبہ کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ 1300 سال کے بعد علامہ مرحوم پہلی شخصیت تھے جنہوں نے دین کا تصور پیش کیا۔ لیکن اس تصور کو عام کرنے اور اس کے لئے باقاعدہ ایک جماعت تشکیل کرنے اور پھر ساری عمر اس جماعت کی قیادت کرنے کا شرف مولانا مرحوم کے نام جاتا ہے۔ انہوں نے ساری عمر اس جماعت کے ذریعے اقامت دین کی کوشش جاری رکھی چونکہ مولانا مرحوم کی چند کتابوں کا ترجمہ خلیل حامدی صاحب نے عربی زبان میں بھی کر دیا تھا اس لئے ان کے افکار عرب دنیا میں بھی عام ہو گئے۔ یہ نظریات اپنی ندرت کی وجہ سے عرب دنیا میں بہت پسند کئے گئے اور بہت مقبول ہوئے۔

مولانا مرحوم نے غیر اسلامی نظام میں زندگی بسر کرنے کی حد درجہ مذمت کی ہے اور اقامت دین کی فرضیت کو حد درجہ اہمیت دی ہے۔ ہمارا ایک مضمون بعنوان ''غیر اسلامی نظام میں زندگی بسر کرنا حرام ہے'' رسالہ طلوعِ اسلام میں طبع ہوا تھا۔ لیکن ہمارے دل میں یہ خلش تھی کہ شاید حرام کا لفظ ثقیل ہے اور اس کا استعمال مناسب نہیں تھا۔ لیکن اتفاق سے مولانا کی کتاب اسلام کی چار بنیادی اصطلاحیں پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ کتاب اس سے پیشتر کئی مرتبہ پڑھی تھی۔ لیکن یہ موضوع زیرِ غور

نہیں تھا تو یہ فقرہ ابھر کر سامنے نہیں آیا۔ مولانا نے اس کتاب میں ایک حاشیہ پر تحریر فرمایا ہے کہ غیر اسلامی نظام میں زندگی بسر کرنا جرم ہے۔ مولانا نے حرام کی جگہ جرم تحریر کیا تھا۔ ان کے اس فقرہ سے ہمیں اطمینان حاصل ہو گیا۔

تحریکِ طلوعِ اسلام اور جماعتِ اسلامی میں اس بات پر اشتراک ہے کہ غیر اسلامی نظام کی اطاعت جرم ہے۔ غیر اسلامی نظام میں زندگی بسر کرنے والا ایک ایک فرد مجرم ہوتا ہے اور اس نظام کے قائدین ''اکابر مجرمین'' یعنی مجرموں کے سردار ہوتے ہیں (6:123) البتہ وہ شخص جو بہت معذور ہو وہ غیر اسلامی نظام میں رہ سکتا ہے اور وہ حضرات جو غیر اسلامی نظام کی جگہ اسلامی نظام قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ دو قسم کے لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں اور وہ مجرم نہیں ہیں۔

تحریکِ طلوعِ اسلام اور جماعت اسلامی کا بنیادی اور اساسی فرق یہ ہے کہ جماعتِ اسلامی روحِ انسانی اور روحانیت کی قائل ہے اور روحانیت میں اضافے اور اس کے حصول کو زندگی کا مقصد شمار کرتی ہے۔ لیکن قرآنِ کریم میں روح انسانی روحانیت اور معرفت کے الفاظ ہی نہیں آئے اور نہ ان کا کسی جگہ مطالبہ کیا گیا ہے۔ روحانیت کے حصول کے لئے کسی نظام کی ضرورت نہیں ہوتی۔ روحانیت کے حصول کے لئے دنیاوی علائق کو چھوڑنا ضروری ہوتا ہے۔ اس کا حصول پرستش کے ذریعے ہوتا ہے جو پہاڑوں، جنگلوں، کونوں کھدروں میں بھی ہو سکتی ہے۔ نیز پرستش غیر اسلامی نظام میں بھی ہو سکتی ہے۔ پرستش کا کسی نظام سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ جب نجات کا ذریعہ اور مقصدِ حیات روحانیت ٹھہری اور اس کے حصول کا ذریعہ پرستش کو قرار دیا گیا تو پھر اسلامی نظام کے قیام کی ضرورت باقی نہیں رہتی اور نہ ہی کوئی جماعت اس کے قیام کے لئے کوشش کرے گی۔ ہمارے ہاں تبلیغی جماعت اس کا عملی پیکر موجود ہے۔ ان کا کسی نظام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ صرف پرستش میں مصروف ہیں۔ ان کے نزدیک پرستش اللہ تعالیٰ کی اور اطاعت غیر اسلامی نظام کی جائز ہے۔

لیکن حضرت مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے اپنی نہایت قیمتی اور اہم کتاب ''تزکیۂ نفس'' میں تحریر کیا ہے کہ اطاعت ایک اتھارٹی کی کرنا اور پرستش اللہ تعالیٰ کی کرنا، وہی شخص کر سکتا ہے جس کے دماغ میں بہت بڑا فتور اور خلل واقع ہو۔ آج پوری امتِ مسلمہ اس خلل میں مبتلاء ہے اور حیرت یہ ہے کہ جماعتِ اسلامی جو خود دین کی داعی ہے وہ بھی اس اختلال ذہنی میں شامل ہے اس اختلال کا نتیجہ یہ ہے کہ آج اس وسیع و عریض زمین کے اوپر ایک گز زمین بھی ایسی نہیں ہے جہاں اللہ کی اطاعت ہو رہی ہو۔

روحِ انسانی کے نظریہ کی بجائے، تحریکِ طلوعِ اسلام کا یہ نظریہ ہے کہ زندگی اس کائنات کے وجود میں آنے سے پیشتر سے موجود تھی (76:1)، لیکن چونکہ اس نے کوئی پیکر اختیار نہیں کیا تھا اس لئے اس وقت تک اس کا کوئی نام بھی نہیں تھا۔ جب زندگی اپنے اولین جرثومہ میں آئی تو اس کا نام زندگی دیا گیا، جو ہزاروں سال میں ترقی کرتے کرتے حیوانیت کے درجہ میں پہنچی۔ پھر جب اس کو ایک اگلی نوع میں ترقی کرنی ہوئی تو یہ بطور ایک نوع کے ایک کُل کی حیثیت سے، انسانیت کی حدود میں داخل ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے اس زندگی کو ایک صلاحیت عطا فرمائی جس نے اس نوع کو حیوانیت سے بلند کر دیا اور یہ صلاحیت

مابہ الامتیاز قرار پائی۔ اس صلاحیت کو جب اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے تو قرآنِ کریم نے اس کو روح کے لفظ سے پکارا ہے اور جب اس صلاحیت کو انسان کی طرف منسوب کیا تو قرآن نے اس کو ''نفسِ انسانی'' سے موسوم کیا۔ قرآن کی رُو سے روحِ خداوندی تو ہے لیکن روحِ انسانی کا قرآن قائل نہیں ہے۔

ہر بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو وہ چند انچ کے جسم اور اس صلاحیت پر مشتمل ہوتا ہے۔ جسم انسانی اور اس صلاحیت ''نفس انسانی'' کی پرورش کرنا، یہ انسان کی زندگی کا مقصد قرار دیا گیا ہے۔ انسان کے جسم کی پرورش اُنہیں طبعی قوانین کے مطابق ہوتی ہے جن سے حیوانات کے جسم کی ہوتی ہے۔ البتہ نفسِ انسانی کی پرورش کے اصول وقواعد کے لئے انسان وحی کا محتاج ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم نے اس ''نفس انسانی'' کی پرورش کرنا، ہر انسان کی زندگی کا مقصد قرار دیا ہے۔ قرآنِ کریم نے اس ''نفسِ انسانی'' کی پرورش کے اصول واضح طور پر بتا دیئے ہیں۔ نفس کی پرورش قرآن کے قوانین کے اتباع سے ہوتی ہے (2:233؛2:286)، اس کی پرورش مستقل اقدار پر عمل کرنے سے ہوتی ہے۔ یہ مستقل اقدار صرف وحیٔ الٰہی عنایت کرتی ہے عقل انسانی مستقل اقدار نہیں بنا سکتی۔ نیز یہ کہ نفس کی پرورش صفاتِ خداوندی کو اپنے میں زیادہ سے زیادہ پیدا کرنے سے ہوتی ہے۔ اقامتِ دین اس لیے ضروری ہوتا ہے کہ صرف اس نظام میں قرآنی قوانین کا اتباع اور مستقل اقدار پر عمل ہوسکتا ہے۔ اور صرف اسی نظام میں صفاتِ خداوندی بھی پیدا ہوسکتی ہیں۔ چونکہ اسلامی نظام احکاماتِ قرآنی نافذ کرتا ہے، اس لئے اس نظام کی اطاعت ہی عبادتِ خداوندی ہوتی ہے۔ جب آپ ٹریفک سگنل پر سپاہی کے اشارے پر رُکتے ہیں یا آگے جاتے ہیں، اور اس کی اطاعت کرتے ہیں، تو آپ اسلامی نظام کی اطاعت کرتے ہیں اور یہی اطاعت عبادتِ خداوندی ہوتی ہے۔ قرآنِ کریم نے حکم دیا کہ جب کسی کو قرض دو یا جب تم کسی سے قرض لو، تو اس کو لکھ لیا کرو۔ اب جب آپ کسی کو قرض دیتے ہیں اور اس کو تحریر میں لاتے ہیں تو آپ اسلامی نظام کی اطاعت کرتے ہیں اور یہی عبادت خداوندی ہوتی ہے۔

اس کے برخلاف جماعتِ اسلامی، اسلامی نظام کی اطاعت کو عبادتِ خداوندی قرار نہیں دیتی۔ وہ عبادتِ خداوندی کے لئے صرف پرستش کو ہی ذریعہ قرار دیتی ہے۔ حیرت اس بات پر ہے کہ مولانا نے طاغوتی نظام کی اطاعت کو تو جرم قرار دے دیا، جو قرآن کی رو سے بالکل درست ہے (26:151)، لیکن اس کے باوجود وہ اسلامی نظام کی اطاعت کو عبادتِ خداوندی نہیں قرار دیتے۔ یہ جماعت اسلامی کی بنیادی غلطی ہے اور جب تک وہ اس نظریہ کی تصحیح نہیں کریں گے۔ اسلامی نظام کسی جگہ بھی، کبھی بھی قائم نہیں ہوسکتا۔

ہماری ایک کتاب بنام ''احمدیت جس کے تمام عقائد قرآن کے خلاف ہیں۔'' ہماری ویب سائٹ پر موجود ہے۔ جو ہر شخص کی دسترس میں ہے۔ ہم نے اس کتاب میں برخلاف قرآن عقیدہ کی تردید کی ہے۔ حیرت یہ ہے کہ جماعتِ اسلامی بھی ان تمام خلافِ قرآن عقائد کو تسلیم کرتی ہے کیا یہ بات تعجب انگیز نہیں ہے کہ عقائد تو ایک ہی ہیں اگر وہ احمدی حضرات اختیار

کرتے ہیں تو وہ غلط اور اگر وہ عقائد ہماری پیشوائیت اور جماعتِ اسلامی اختیار کرتی ہے تو وہ عقائد درست خیال کئے جاتے ہیں۔

ہم وہ دس خلافِ قرآن عقائد اسی کتاب کے صفحہ 12 سے نقل کرتے ہیں۔

(1) احمدیت اور ہماری پیشوائیت رسول اور نبی میں فرق کرتی ہے۔ اس عقیدہ سے مرزا صاحب نے بہت فائدہ اٹھایا۔

(2) احمدیت اور ہماری پیشوائیت وحی خفی کو درست تسلیم کرتی ہے۔

(3) الہام کا عقیدہ قرآن کے خلاف۔

(4) روحِ انسانی کا عقیدہ قرآن کے خلاف ہے۔

(5) نزول مسیح کا عقیدہ قرآن کے خلاف ہے۔

(6) آمدِ مہدی کا عقیدہ قرآن کے خلاف ہے۔

(7) فرقہ بندی قرآن کے خلاف ہے۔ قرآن کے نزدیک وہ شرک ہے۔

(8) پیشگوئی کرنا قرآن کے خلاف ہے۔

(9) استخارہ کرنا قرآن کے خلاف ہے۔

(10) محدِّثیّت کا عقیدہ قرآن کے خلاف ہے۔

یہ وہ دس عقائد ہیں جو سب قرآن کے خلاف ہیں اور جن کو احمدیت اور جماعتِ اسلامی دونوں درست سمجھتے ہیں۔ ہم نے ترتیب وار ان عقائد کی تردید اس کتاب میں کی ہے۔ چونکہ یہ عقائد قرآن کے خلاف ہیں اس لئے تحریکِ طلوعِ اسلام ان خلافِ قرآن عقائد کو نہیں مانتی اور یہ ایک بہت بڑا فاصلہ جماعت اور تحریکِ طلوعِ اسلام کے درمیان ہے۔

تاریخ اسلام میں یہ پہلا دور ہے جب اسلامی عقائد کو عقل و علم کی میزان پر پرکھا جا رہا ہے۔ معجزات کا عقیدہ عقل و علم اور قرآن کے خلاف ہے۔ قرآن بار بار چیلنج کرتا ہے کہ اگر تم سچے ہو تو هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (2:111) اگر تم سچے ہو تو دلیل لاؤ۔ وہ کہیں معجزات نہ طلب کرتا ہے نہ صداقت کی دلیل سمجھتا ہے۔ جواب دلیل سے دینا ہوگا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ (12:108) میں اور ہر وہ شخص جو میرا متبع ہے اللہ کی طرف دلیل سے بلاتے ہیں۔ حضور کے اس قول نے معجزہ کے عقیدہ کی جڑ کاٹ کے رکھ دی کیونکہ قرآن میں کہیں نہیں آیا کہ میں اللہ کی طرف معجزہ کے ذریعے بلاتا ہوں۔ لیکن حیرت ہوتی ہے کہ مولانا خود اور ان کی جماعت معجزات کو درست سمجھتی ہے۔ جماعت اور تحریک کے درمیان یہ بھی ایک فاصلہ قابلِ غور ہے۔

جماعتِ اسلامی کا نظریۂ شریعت کے متعلق بھی بالکل مذہب پر مبنی ہے۔ ہماری کتاب بنام ''مسلمانوں کی خودساختہ

خلافِ قرآن شریعت'' ہماری ویب سائٹ پر موجود ہے۔ اس موضوع کی تفصیل وہاں ملاحظہ فرمائیں۔ تاہم ہم یہاں ضرورت کے مطابق شریعت کی وضاحت کرتے ہیں۔

قرآنِ کریم کے سامنے ایک مملکت ہے۔ اللہ تعالیٰ اس مملکت کو چلانے کے اصول عطا فرماتا ہے۔ چونکہ یہ مملکت مختلف ادوار میں جاری رہے گی۔ اس لئے قرآنِ کریم میں زیادہ تر اصول عطا کئے گئے ہیں۔ ان اصولوں کی جزئیات مختلف ادوار میں مختلف ماحول کی وجہ سے تبدیل ہوتی جائیں گی۔ اپنی ریاستِ مدینہ میں حضور ﷺ اس کے سربراہ تھے اور اولوالامر اس کے مقامی حکام تھے قرآنِ کریم کی رُو سے مقامی حکام کی اطاعت بھی فرض ہوتی ہے۔ (4:59) اللہ تعالیٰ کی طرف سے احکام حضور ﷺ کو ملتے تھے۔ آپ ﷺ ان کی جزئیات مقرر فرما کر، مقامی حکام کو ان جزئیات سے آگاہ فرما دیتے تھے۔ قرآنِ کریم نے ایتائے زکوٰۃ کا حکم صادر فرمایا۔ حضور ﷺ نے اپنے دور کے مطابق اس کا ایک نصاب بنا دیا جس پر خود حضور ﷺ اور اولوالامر عمل کرتے تھے۔ قرآنِ کریم نے نکاح کے لئے بلوغت شرط رکھی ہے (4:6) بلوغت کو Define کر کے حضور ﷺ نے نکاح کی عمر مقرر کر دی۔ حضور ﷺ وحی کے ذریعے اصول حاصل کر رہے تھے۔

(طلوعِ اسلام، نومبر 2020ء، صفحہ: 51)

ہماری فقہ غیر اسلامی حکومت میں وضع ہوئی ہے۔ اس لئے یہ اسلامی شریعت نہیں لیکن جماعتِ اسلامی اس شریعت کو ہی حجت سمجھتی ہے۔ اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ اس سے فرقہ بندی کو ہوا ملتی ہے۔

فقہی قانون بنانا صرف اسلامی حکومت کا حق ہے۔ ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہماری شریعت حضور ﷺ سے 250 سال بعد بنائی گئی جبکہ اسلامی حکومت کا کہیں نام ونشان تک نہیں تھا۔ بلکہ بنوعباس کی ملوکیت قائم تھی ہماری شریعت کی تشکیل میں حکومت کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ اُس دور کے علماء نے مختلف مسائل پر اپنی اپنی آراء پیش کی ہیں۔ وہ آراء جمع کر لی گئیں اور ان کو ہی شریعت کہا جانے لگا۔ ہماری شریعت، اسلامی شریعت نہیں ہے۔ اس کا اسلام سے دور دور کا تعلق نہیں۔ یہ شریعت ملوکیت ہے لیکن افسوس، صد افسوس، صد ہا بار افسوس کہ مولانا خود اور جماعت اسلامی اس موجودہ خلافِ قرآن شریعت کو، شریعت اسلامی قرار دیتے ہیں اور شریعت کے نفاذ کو اسلامی مملکت کہتے ہیں۔ اس شریعت کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ یہ خلافِ قرآن ہے اور دوسرا نقصان یہ ہے کہ اس سے فرقہ بندی کو ہوا ملتی ہے اور وہ مضبوط ہوتی ہے۔ اس شریعت کی وجہ سے بردہ فروشی، محجوب الارث، عید کی قربانی اور صد ہا غیر قرآنی احکام مسلمانوں میں جاری ہیں اور مولانا اور ان کی جماعت ان کی حمایت کرتی ہے۔

ہم سوشل میڈیا استعمال نہیں کرتے۔ ہمیں ہمارے ایک دوست نے بتایا ہے کہ محترم جناب سراج الحق صاحب امیرِ جماعت اسلامی نے ایک پریس کانفرنس میں حکومت کو مشورہ دیا ہے کہ حکومت اپنے Taxes یعنی اپنے Revenue کو

زکوٰۃ قرار دے دے تو عوام ان Revenues کو بخوشی ادا کرنے لگیں گے۔ ہمیں ان کے اس بیان سے تعجب ہوا کیونکہ قرآنی حکومت کو ٹیکس ادا کرنے کا یہ نظریہ تحریکِ طلوعِ اسلام کا ہے، جماعت اسلامی کا یہ نظریہ ہرگز نہیں تھا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ زکوٰۃ دینا اللہ کی عبادت ہے اس کو ٹیکس میں تبدیل کرنے سے Tax کی ادائیگی عبادتِ خداوندی ہوجائے گی اور اسلامی نظام کی اطاعت جو تحریک طلوعِ اسلام کا موقف ہے۔ یہ بات بھی واضح رہے کہ حکومت کو ٹیکس ادا کرنا، اور اس سے الگ زکوٰۃ کو اللہ کے نام پر ادا کرنا، سیکولر حکومت میں ہوتا ہے۔ اسلامی حکومت میں صرف ایک Tax ہوتا ہے۔ وہی زکوٰۃ ہوتا ہے۔ اور اس کا ادا کرنا عبادتِ خداوندی ہوتی ہے۔

زکوٰۃ کی اس شرح سے حکومت نہیں چل سکتی۔ اس کو یقیناً تبدیل کرنا ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں مقرر کردہ جزئیات کو حالات کے مطابق تبدیل کرنا تحریکِ طلوعِ اسلام کا نظریہ ہے۔ جماعتِ اسلامی حضور ﷺ کی مقرر کردہ جزئیات کو تبدیل کرنے کی قائل نہیں ہے۔ پھر جب زکوٰۃ تبدیل ہوسکتی ہے تو صلوٰۃ میں بھی تبدیلی ہوسکتی ہے۔ آپ غور فرمارہے ہیں کہ یہ دونوں نظریات کہ اسلامی نظام کی اطاعت عبادتِ خداوندی ہے اور حضور ﷺ کی مقرر کردہ جزئیات میں تبدیلی ہوسکتی ہے یہ دونوں نظریات صرف تحریک کے نظریات ہیں۔ جماعت اسلامی اور ہماری پیشوائیت ان دونوں نظریات کے خلاف ہے لیکن زمانے کے تقاضے کس طرح جماعت کو مجبور کررہے ہیں کہ وہ تحریک کے نظریات کو قبول کرلے۔

مولوی وہ ہے جو مذہب کا داعی ہے خواہ اس کے داڑھی ہو یا شیو ہو۔ جماعت اسلامی کی سب سے بڑی لغزش یہ ہے کہ یہ مذہب کو دین کے طور پر جاری کرنا چاہتی ہے اور مذہب کو چھوڑنا نہیں چاہتی۔ لیکن مذہب کو بطور دین جاری کرنا ممکن نہیں ہے۔ یا مذہب چلے گا یا دین، دونوں ساتھ نہیں چل سکتے۔

انقلاب ایران بھی صرف اس وجہ سے ناکام ہوا کہ انہوں نے مذہب کو دین کی حیثیت سے جاری کردیا تھا اور ولایت فقیہ اس کا نام رکھ دیا تھا۔ جعفری فقہ نافذ کیا۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ تشیع میں اسلامی نظام کا تصور ہی نہیں ہے۔ تشیع میں امامت کے لئے غلبہ و اقتدار شرط نہیں ہے۔ بغیر اقتدار کے بھی امامت مل سکتی ہے۔ اسی وجہ سے شیعہ حضرات کے ہاں امام بغیر اقتدار کے غلبہ کے بھی ہوسکتا ہے۔ یہاں شیعت پر تبصرہ کرنا مقصود نہیں ہے۔ انقلاب ایران کے فیل ہونے کی وجہ بتانا مقصود ہے۔ جب تک آپ مقامی حکام، اولوالامر کی اطاعت کو عبادت خداوندی قرار نہیں دیں گے۔ اسلامی نظامِ قائم نہیں ہوسکتا۔ لیکن شیعوں کے تمام فرقے اور تمام مجتہدین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اولوالامر صرف آئمہ اہلِ بیت ہیں۔ اب جب ایران میں نظام قائم ہوا تو اولوالامر کی اطاعت پر اُنہیں اپنے موقف کو تبدیل کرنا پڑا۔ لیکن اس سلسلہ میں اب بھی ان میں Confusion ہے، ان کا عقیدہ کہ صرف آئمہ اہلِ بیت، اولوالامر ہیں مذہب میں تو چل سکتا تھا۔ دین میں یہ نہیں چل سکا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(گذشتہ سے پیوستہ)

دوقومی نظریہ پاکستان کی اِسلامی مملکت میں اِنسانی ذات کا ارتقاء

باب نمبر:3

اللہ کا عدم سے مُضمِر وجود کی خلق کی ابتداء سے ارتقائی مراحل طے کرتے ہوئے ہماری دنیا کے اِنتہائی اِنسانی ذات کے مقام تک کا سفر

عصرِ جدید میں بھی حکمائے مغرب تخلیقِ کائنات کی گتھیوں کو سُلجھانے میں لگے ہوئے ہیں اور مغربی سکالر سمپسن کا نظریہِ ارتقاء کا آغاز اِس سوال سے اُٹھتا ہے کہ انسان کہاں سے آیا، کیوں آیا اور کہاں جائے گا؟ اِن سوالات کے نتیجہ میں بنیادی سوال یہی سامنے آتا ہے کہ زندگی کی ابتداء کیسے ہوگئی؟ سمپسن کے نزدیک نہایت دیانتداری سے اس کا جواب یہ ہے کہ ہمیں اس کا کچھ علم نہیں۔ حقیقت تو یہی ہے کہ دنیا کا بڑے سے بڑا سائنسدان بھی عقل کے استعمال سے اِس کا تسلی بخش جواب نہیں دے سکا کہ کائنات اور ہم عدم سے کیسے وجود میں آئے؟ کائنات کی اولین کڑی عدم سے وجود کا لاینحل مسئلہ ایک راز ہے، جو اِنسانی عقل کے حیطہ اِدراک کے محدود دائرہ میں سمجھا ہی نہیں جا سکتا ہے۔ تاریخِ عالم میں ہم دیکھتے ہیں کہ کائنات کو کسی خیالی یا تصوراتی دیوی دیوتاؤں سے منسوب کارناموں کے طریقے پر سمجھا اور سمجھایا جاتا تھا۔ اِن کا جواب مذہب تو کسی نہ کسی شکل میں دے دیتا ہے مگر سائنس ان جوابات کو تسلیم نہیں کرتی۔ حقیقت تو یہی ہے دنیا کا بڑے سے بڑا سائنسدان بھی عقل کے استعمال سے جواب نہیں دے سکتا کہ کائنات اور ہم عدم سے کیسے وجود میں آئے؟۔ زمانہ گزرنے کے ساتھ ہم دیکھتے ہیں کہ قدیم یونانی دور ہی میں لوگ اِن معاملات پر عقل وشعور سے سمجھنے اور سمجھانے کی ابتدائی کوشش میں مصروف ہو گئے۔ لہٰذا مناسب ہوگا کہ تخلیقِ کائنات کی عدم سے وجود کی زمانہِ قدیم میں حُکماء اور خصوصاً قدیم حُکمائے یونان کی تحقیق کی طرف سے دریافت میں کی گئی کاوشوں کی تحقیق کو سامنے لایا جائے۔

1۔ زمانہِ قدیم کے حکمائے یونان کا تخلیقِ کائنات کا عدم سے وجود کا تصور:

قدیم یونانی حُکماء نے اپنے زمانہ میں اُس وقت کے محدود علم کی روشنی میں دیوی، دیوتاؤں کے تصورِ خالقِ کائنات سے

لوگوں کو چھٹکارا دلوانے میں خاصی حد تک کامیاب رہے۔ عقلی توجیہات سے بطور خالقِ کائنات اللہ کا تصور پیش کرنے کا سہرا تھالیس کو جاتا ہے۔ وہ آج سے 26 سو سال کے لگ بھگ ہمارے دور سے پیشتر 624 قبل مسیح پیدا ہوا اور 556 قبل مسیح فوت ہوا۔ قدیم یونانی مفکرین کی جانب سے انسانی تاریخ میں یہ پہلی کوشش تھی کہ کائنات کو کسی خیالی یا تصوراتی طریقے پر بیان کرنے کی بجائے کائنات کی حقیقت کو فطری اور سائنسی طریقے پر انسانی مشاہدہ سے ثابت کیا جائے۔ اِسی سے فلسفہ کے علم کی ابتدا ہوئی، جس کا سہرا تھالیس (Thales) کے سر پر باندھا جاتا ہے۔

(i) یونانی مُفکر تھالیس کا نظریہ:

اُس نے آج سے 26 سو سال کے لگ بھگ اصولی طور پر یہ نظریہ دیا کہ تمام مادی اشیاء کا بنیادی مادہ پانی ہے اور یہ کہ ہر چیز پانی سے نکلی ہے اور آخر کار دوبارہ پانی میں مِل جائے گی۔ اُس کے بعد اناکسی مینڈ Anaximander) کا تصور یوں سامنے لایا جاتا ہے کہ

(ii) اناکسی مینڈر آ نظریہ:

وہ تھیلس کے اس اصول سے مُتفق تھا کہ مادی اشیاء کا بنیادی یا حتمی اصول مادہ ہی ہے، لیکن اس نے مادہ کو پانی کا نام نہیں دیا۔ اُس کے خیال میں اشیاء کا اصول جامد مادہ تھا وہ بے صورت، غیر متعین اور لامحدود تھا، جو مُختلف مراحل سے گُزر کے مُختلف اشکال اختیار کر لیتا تھا۔ اُس کے بعد اناکسی مینیز (Anaximenes) کا نظریہ سامنے آتا ہے۔

(iii) اناکسی مینز کا نظریہ:

اُس نے اپنے پیشرو کی طرح بے صورت، غیر متعین، لامحدود اور بے نام مادے کا انتخاب نہیں کیا، بلکہ اُس نے کائنات اور مادی دنیا کا بنیادی اصول ہوا کو قرار دیا۔ اُس نے کہا کہ یہ ہوا بھی غیر متعین مادے کی طرح خلا میں پھیلی ہوئی ہے اور مسلسل حرکت میں ہے۔ یہی حرکت کا اصول ہوا کی بنیادی فطرت میں موجود ہے اور یہی اصول کائنات کے وجود میں آنے اور اس کے ارتقاء کا باعث بنا ہے۔

اِس مسئلہ کا حل فیثاغورث (Phythagoreas) نے بھی پیش کیا ہے، جو وضاحت طلب ہے۔

(iv) فیثاغورث کا نظریہ:

اُس کے مؤقف کے مطابق مختلف چیزوں کے خواص میں اتنے زیادہ اختلاف ہونے کے باوجود ان سب میں ایک صفت یا خاصیت آفاقی نوعیت کی پائی جاتی ہے جو کائنات کی ہر چیز میں یکساں موجود ہے، چاہے وہ چیز مادی یا تجریدی (خیالی) ہے۔ وہ صفت یہ ہے کہ دنیا کی تمام چیزیں عددی ہیں اور یہ کہ اُن کو گِنا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں کسی ایسی کائنات کا

تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، جس میں ''ہندسوں'' اور تعداد کا تصور نہ ہو۔ فیثا غورث کا کہنا تھا کہ کسی ایسی کائنات کا تصور تو کیا جا سکتا ہے، جس میں رنگ، ذائقہ نہ ہو اور بے وزن ہوں لیکن کسی دنیا کا تصور نہیں کیا جا سکتا جس میں ہندسوں کا وجود یا ضرورت نہ ہو یا تعداد کا بالکل تصور ہی نہ ہو۔ یہی دنیا کے وجود میں آنے کے بنیادی اصول کا اہم ترین پہلو ہے۔ اُس کے بعد ہراکلیس کا نظریہ اہمیت اختیار کر گیا۔

(v) ہراکلیڈس کا نظریہ:

اُس نے 2500 سال پہلے یہ نظریہ دیا کہ تمام اشیاء آگ سے وجود میں آئی ہیں اور اسی میں واپس مِل جائیں گی۔ اِس کی وضاحت دی کہ آگ دراصل تغیر کی صورت ہے، اِس لئے تغیر و تبدیل کا عمل ہی حقیقی ہے۔ اس کے برعکس وجود یا مُستقل صورت کا قیام سب فریبِ نظر ہے۔ اُس کا مشہور قول ہے کہ حرکت اصل حقیقت ہے۔ دنیا کی ہر چیز مسلسل تغیر و تبدیل کے عالم میں ہے اور نئی نئی صورتیں اختیار کر رہی ہیں۔ ہراکلیٹس کہا کرتا تھا کہ چیز بظاہر یعنی باہر سے اگر ویسی ہی ہو جیسے پہلی تھی تو یہ صِرف اس کے مادے کے حُجم کی وجہ سے ہے لیکن اصل مادہ پہلے والا نہیں رہتا بلکہ بہتے دریا کے پانی کی طرح بدلتا رہتا ہے۔ اِن سب کے بعد دیمقراطس کا مشہورِ زمانہ فلسفہ مادیت کا نظریہ سامنے آیا، جو ابھی تک اہمیت کا حامل ہے۔

(vi) تخلیق کا مادی نظریہ:

مادئین کا خیال ہے کہ اگر یہ اصول تسلیم کر لیا جائے کہ مادے کی مُختلف قسموں کی بنیاد فطری طور پر ایک ہی مادہ ہے تو پھر مادے کی موجود عناصر یعنی ہوا، پانی، آگ اور مِٹی کی مُختلف خاصیتوں کا مسلۂ سامنے آ جاتا ہے کہ پھر یہ بظاہر مُختلف خاصیتیں ایک خاص یا مخصوص خاصیت کیسے اپنائیں گی۔ طبیعین کے نزدیک آگ و آب و خاک و دباؤ (عناصرِ اربعہ) کائنات کے اساسی اجزاہ ترکیبی ہیں۔ اِسی اصول سے نظریہ ارتقاء کا آغاز فلسفہ مادیت سے ہوتا ہے جس کا ابوالآباء دیمقراطس کو قرار دیا جاتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ ہر شے جواہر سے بنی ہے اور جواہر از روئے ہندسہ نہیں بلکہ مادی طور پر نا قابل تقسیم ہیں۔ ان قدیم مادئین کا خیال تھا کہ کچھ بھی ہو، یوں ہی (اتفاق سے) نہیں ہوتا بلکہ ہر بات کسی سبب کے باعث ہوتی ہے۔

وہ جواہر کو لایتجزیٰ کہتے ہیں اس نظریہ کی رو سے یہ تسلیم کیا جاتا تھا کہ:

1۔ یہ تمام لایتجزی اجزا مادی ہیں۔

2۔ ہر شے انہی ذرات سے مرکب ہے۔

3۔ جب یہ باہم مل کر کسی شے کو ترتیب دیتے ہیں، تو ان کے درمیان خلا رہ جاتی ہے۔

4۔ یہ ذرات نا قابل فنا ہیں۔

5۔ یہ ہمیشہ سے حرکت میں ہیں اور ہمیشہ حرکت میں رہیں گے۔

6۔ جواہر تعداد میں لامحدود ہیں۔

7۔ تمام اقسام کے جوہر کی نوعیت ایک ہی ہے۔ ان میں فرق صرف شکل اور جسامت کا ہے۔

8۔ نفس انسانی بھی انھیں اجزاء سے مرکب ہے اور انسانی فکر ان ہی اجزاء کی طبیعی ترتیب سے ظہور میں آتا ہے۔

عصرِ جدید میں بھی حکمائے مغرب تخلیقِ کائنات کی گتھیوں کو سُلجھانے میں لگے رہے، لیکن سمپسن کا نظریہ ارتقاء کا آغاز اِس سوال سے اُٹھتا ہے کہ زندگی کی ابتداء کیسے ہوگئی؟ اُس کے نزدیک نہایت دیانتداری سے اس کا جواب یہ ہے کہ ہمیں اس کا کچھ علم نہیں ہے۔ نظریہ ارتقاء میں کائنات کے عدم سے وجود کا پیدائش کے آغاز کو عصرِ حاضر کی علمی روش میں ایک اتفاق قرار دیا جاتا ہے۔ اِس ضِمن میں قدیم یونانی فِکر عدم سے کائنات کے وجود میں لانے کے مخصوص نظریہ کو آگے بڑھاتے ہوئے عصرِ جدید کے مُفکر ہیکل کا درجِ ذیل ایک نظریہ پیش کرتا ہے۔

ہیکل کا نظریہ:

اِسی نظریہ کو آگے بڑھاتے ہوئے ہیکل کہتا ہے کہ کائنات ڈی بوئس کے سات معموں میں سمٹ گئی ہے۔

(1) ماہیت مادہ اور توانائی (The nature of matter and force)۔

(2) مبداء حرکت (The origin of motion)۔

(3) مبداء حیات (The origin of life)۔

(4) ربطِ اشیائے فطرت (The orderly arrangement of nature)۔

(5) مبداء شعور (The origin of simple sensation and consciousness)۔

(6) مبداء فکر و لسان (Ratoinal thought and the origin of speech)۔

(7) انسانی اختیار کا مسئلہ (the freedom of the will, The quetsion of)۔

ہیکل کے نزدیک پہلے چھ معمّے دو بنیادی اصولوں کے ماتحت حل ہو جاتے ہیں۔ اوّل یہ کہ مادہ اور توانائی غیر متبدل ہیں اور دوم یہ کہ ''کائنات میں عمل ارتقاء جاری ہے جس سے مفہوم یہ ہے کہ غیر شعور اور غیر ذی حیات مادہ سے ارتقائی طور پر زندگی اور شعور پیدا ہو جاتے ہیں''۔

باقی رہا ساتواں معمہ یعنی انسانی اختیار و ارادہ کا مسئلہ تو یہ سوال ایسا ہے ہی نہیں کہ اسے کسی سائنٹیفک تحقیق کا موضوع بنایا جائے کیونکہ اس کی بنیاد ایک عقیدہ پر ہے جو وہم کا پیدا کردہ ہے۔ اس کا حقیقی وجود ہی نہیں۔

قدیم یونانی مفکرین کی تحقیق کا جائزہ لیتے ہوئے یہی نتیجہ آخذ کیا جاتا ہے کہ حقیقت تو یہی ہے کہ دنیا کا بڑے سے بڑا سائنسدان بھی عقل کے استعمال سے جواب نہیں دے سکتا کہ کائنات اور ہم عدم سے کیسے وجود میں آئے؟ کائنات کی اولین کڑی عدم سے وجود کا لاینحل مسلۂ ایک راز ہے، جو اِنسانی عقل کے حیطہ اِدراک کے دائرہ میں نہیں لایا جا سکتا۔ اِس کی وضاحت میں ہم یہاں دو مرحلوں میں بات سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

1۔ پہلی عالمِ عدم میں کچھ نہ ہونے کا مرحلہ

2۔ دوسری عالم عدم سے عالمِ وجود کا مرحلہ

عالمِ عدم میں کچھ نہ ہونے کے مرحلہ کا موٴقف

قرآن میں تخلیق سے قبل زمانہِ عدم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سمجھایا ہے کہ:

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا (76:1)

کیا وقت کے زمانے (الدہر) میں، انسان پر ایسا وقت نہیں گزرا، جب وہ انسانی وجود میں نہ تھا؟ (یعنی مخاطب کرنے کے قابل ہی نہ تھا)۔

لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا:

''جب انسان، انسانی وجود میں نہ تھا''۔ ہمارے ہاں اردو میں ''مذکور'' کے معنی ''قابل ذکر یا جس کا ذکر پہلے ہو چکا'' کیا جاتا ہے، لیکن عربی میں مذکور کے معنی ہیں وہ جو خود اپنے وجود میں موجود ہو۔ پہلی بات تو انسان کے متعلق یہ آ گئی کہ عالم امر میں اس کا وجود نہ تھا، اور دوسری بات یہ کہ عالم خلق میں یہ خود بخود اتفاق سے وجود میں نہیں آ گیا ہے۔ اس کی تخلیق خدا نے ہی کی ہے۔ قرآن کریم اور عربی زبان میں وقت کے لئے دو الفاظ ''دہر'' اور ''عصر'' آتے ہیں۔ ''ابتداء سے انتہا تک طویل المدّت عرصے'' کو عرب ''دہر'' کہتے تھے اور اِس کے تھوڑے عرصے یا وقت کو وہ عصر یا زمان کہتے تھے۔ بہر حال قرآن نے یہاں ''دہر'' کہا ہے۔ یہ آگے وضاحت ہو رہی ہے کہ انسان کے متعلق عالم امر یعنی ازل میں پلاننگ سے لے کر اسکو اختیار و ارادہ عطا کرنے کا عرصہ ''الدہر'' ہی میں آیا ہے۔ ازل میں تو اس کا وجود ہی نہ تھا۔ البتہ عالم خلق میں یہ وجود میں تو آ گیا تھا، لیکن انسان کہلانے کے قابل نہیں ہوا تھا، یعنی یہ انسانی وجود میں نہ تھا۔ اسی ازل سے ہمیشہ رہنے والے وقت (ٹائم) الدھر کے دوران، خدا نے اسے اس قابل بنا دیا کہ یہ اِنسان کی صورت میں سامنے لایا گیا۔ اب آیت کا مفہوم یہ ہو جائے گا کہ ''دہر کے ٹائم میں کیا انسان پر وہ عرصہ نہیں گزرا، جب یہ انسانی وجود میں ہی نہ پہنچا تھا''۔

قرآن سے ہی ہمیں راہنمائی ملتی ہے کہ:

اِنَّهٗ هُوَ یُبْدِئُ وَ یُعِیْدُ ﴿۱۳﴾ (85:13)

وہ (خدا) ہر شے کی پیدائش کا، ایک پست ترین نقطہ سے آغاز کرتا ہے، اور پھر مختلف ارتقائی مراحل میں سے گزار کر، شے کو نقطۂ تکمیل تک پہنچا دیتا ہے۔

اس آیت میں دو لفظ ہیں یُبْدِئُ اور یُعِیْدُ۔ ''یُبْدِئُ'' کے معنی ہیں ابتدا کرنا۔ سوال یہ ہے کہ جب کچھ نہیں تھا تو یہ کائنات کیسے عدم سے وجود میں آ گئی؟ یہ وہ نقطہ ہے، جس نے انسان کو ورطۂ حیرت میں ڈال رکھا ہے۔ اس سوال کے جواب میں پہلا انسان حیرت کے جس مقام پہ تھا، اسی مقام پہ آج کا انسان بھی ہے اور آخری انسان بھی حیرت ہی کے مقام پہ ہوگا کہ کائنات کی ابتدا کہاں سے ہوگئی؟ یہ سلسلۂ کائنات کیسے وجود میں آ گیا؟ دہریوں نے کہہ دیا کہ کسی نہ کسی طرح یہ سلسلہ کائنات وجود میں آ گیا۔ خدا پہ ایمان والوں نے کہہ دیا کہ خدا اس کو عدم سے وجود میں لے آیا۔ پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا کہاں سے آ گیا؟ یہ عقل کے بس کی بات نہیں ہے، کیونکہ عقل انسانی محدود ہے اور خدا لامحدود ہے، اور لامحدود، محدود میں نہیں سما سکتا۔ خدا کو ماننے والے، دہریوں سے پوچھتے ہیں کہ تم کہتے ہو کہ کائنات از خود وجود میں آ گئی ہے، تو بتاؤ کائنات از خود کیسے وجود میں آ گئی ہے؟ اس کا تو ضرور کوئی خالق ہوگا، جس نے کائنات کو پیدا کیا ہے۔ اس دلیل سے خدا کو ماننے والے سمجھتے ہیں کہ ہم خالق تک پہنچ گئے ہیں اور دہریوں کو شکست دے دی ہے۔ اس کے بعد دہریوں کی طرف سے اعتراض آتا ہے کہ جب تم خود مانتے ہو کہ بغیر خالق کے کوئی شے وجود میں نہیں آ سکتی، تو پھر جسے تم خالق کہتے ہو، جسے تم خدا کہتے ہو، وہ پھر بغیر خالق کے کیسے وجود میں آ گیا؟ اس کا جواب عقل انسانی نہیں دے سکتی۔ یہاں پہنچ کر از خود موجود خالق کو ''فرض'' کرنا پڑتا ہے، کہ وہ ایک ایسی ہستی ہے، جس کا کوئی خالق نہیں ہے، اور وہ از خود ہے۔ حساب میں ایک کلیہ فرض کرنے کا ہے۔ اگر فرض نہ کیا جائے، تو حساب کا سوال نکلتا ہی نہیں۔ کیونکہ خدا کو فرض کرنے سے انسانی دنیا کے سوالات کا حل ملتا چلا جاتا ہے، اس لئے ہم خدا کو ازلی وابدی ''فرض'' کرتے ہیں، اور اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ ایک نہیں بلکہ تمام انبیائے کرامؑ کی، خدا کی طرف سے عطا کردہ تعلیم کے انسانی معاشرے میں مثبت نتائج یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ خدا کو ٹھیک فرض کیا گیا ہے۔

قرآن کے مطالعہ سے ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ خدا کے عالمِ امر کے تخلیقی پروگرام میں ایک ایسا مرحلہ بھی متعارف ہوتا ہے۔ جو محسوس بنیادی عناصر کو عدم سے وجود میں لانے کا ہے۔ اس کے لیے قرآن نے بدعَ اور فَطَرَ کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ یعنی کسی شے کو پہلے پہل وجود میں لانا۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو:

بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ (2:117)

(مادہ کے بغیر) عدم سے آسمانوں اور زمین کا بنانے والا ہے۔

مزید یہ کہ:

فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ (12:101)

''عدم سے آسمانوں اور زمینوں کا پیدا کرنے والا۔''

یعنی وہ (خدا کی) ذات جو عناصر کائنات کو پہلے پہل عدم سے وجود میں لائی۔

واضع رہے کہ نہ تو قرآن کریم کوئی سائنس کی کتاب ہے اور نہ ہی اس وقت ہمارا موضوع مادہ کی سائنٹیفک تشریح ہے۔ ہمیں کہنا صرف یہ ہے کہ مفردات اپنی محسوس شکل میں ہوں یا توانائی کی صورت میں اصل سوال مسئلہ ارتقاء کا یہ ہے کہ یہ وجود میں کیسے آ گئے۔ قرآن کریم نے اسے ''بَدَعَ'' اور ''فَطَرَ'' سے تعبیر کیا ہے، یعنی یہ کہہ دیا کہ خدا انہیں عدم سے وجود میں لے آیا۔ اس سے آگے بات انسان کے حیطہ ادراک میں آ ہی نہیں سکتی۔ ہمارا ذہن یہ سمجھ ہی نہیں سکتا کہ کوئی شے عدم سے کس طرح وجود میں آ سکتی ہے۔ یہ اشیاء موجود ہیں۔ ان کے وجود سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ کوئی نہیں بتا سکتا کہ وہ وجود میں کیسے آ گئیں۔ آئن سٹائن جیسا عظیم سائنس دان بھی کہہ سکا تو فقط اتنا کہ:

''طبیعی سائنس نے اب تمام اشیاء کو حرکت میں تبدیل کر دیا ہے..... کائنات، جو ہمیں اشیاء کا مجموعہ نظر آتی ہیں۔ ایک ٹھوس شے نہیں، جو فضا میں پڑی ہے۔ یہ شے ہے ہی نہیں بلکہ عمل ہے یا حوادث کی عادت ہے۔''

کائنات کی محسوس شکلوں کے پیچھے جو اصل حقیقت ہے، اس کے لیے طبیعات کے پروفیسر ڈاکٹر جیمز آرنلڈ کا مقولہ زبانِ زدِ عام ہے کہ:

''نظامِ فطرت اپنی گہری بنیادی سادگی میں اس قدر تحیّر انگیز ہے کہ دنیائے سائنس میں کسی موضوع پر حرفِ آخر، آخری انسان کے لیے ہی چھوڑ دینا پڑتا ہے۔''

2۔ دوسری عالم عدم سے عالمِ وجود کا مرحلہ:

قرآن کا مؤقف ہے کہ اللہ نے اپنی مشیت سے عدم سے کائنات کے وجود کی تخلیق کی ہے، جو تفضیلی تجزیہ کا متقاضی ہے۔

وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (2:117)

''اور جب وہ ایک کام کا حکم کرتا ہے تو اُسے کہہ دیتا ہے، ہو، سو وہ ہو جاتا ہے۔''

خدا کا امر کیا ہوتا ہے اور کس طرح عمل پیرا ہوتا ہے؟ اس کے متعلق ہم کچھ نہیں جان سکتے۔ ''کُن'' کے بعد خدا کا ارادہ شے کے بہت پست ترین نقطے فَيَكُوْنُ میں ڈھل جاتا ہے اور شے عالم خلق میں بنتی چلی جاتی ہے۔ اب شے پر طبیعی قوانین کا

اطلاق ہوتا ہے۔ خدا نے یہاں انسان کو انسانی زبان میں سمجھانے کے لئے کہا کہ جب وہ اپنے ارادے کو، اپنے پلان کو، اپنی اسکیم کو، اپنی منشآ کو کہتا ہے کہ ''کن''، تو اس کا ارادہ بروئے کار آنا شروع ہو جاتا ہے۔ ارادہ کس طرح بروئے کار آتا ہے، ہم نہیں جان سکتے۔ خدا سچ مچ ''کُن'' کا لفظ ادا نہیں کرتا، یہ تو خدا نے انسانوں کو سمجھانے کے لئے ایسا کہا ہے، ورنہ ہم عالمِ امر کے متعلق کچھ نہیں جان سکتے۔

قرآن خدا کو فاطر اور بدیع کی اصطلاحات سے مخاطب کرتا ہے کہ

فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (12:101) اور مزید

بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (2:117)

ابتدا کرنے والا۔

اس ابتدأ سے یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا ہر شے، جس طرح آج موجود ہے، کیا اسی طرح ابتدأ سے وجود میں آ گئی تھیں؟ انسان کا ذہن تو موجودہ وجود ہی کو شے کی ابتدأ سمجھتا چلا آ رہا تھا، لیکن ہمارے دور میں یہ چیز سامنے آئی کہ نہیں! اشیاء کی ابتدأ تو بہت ہی پست ترین حالت سے، حقیر سی حالت سے وجود پذیر ہونا شروع ہوئی ہے، پھر ہر شے مختلف ارتقائی مراحل میں گردشیں کرتی ہوئی، مختلف منازل طے کرتی ہوئی، آگے بڑھتی ہوئی، موجودہ شکل یا ہیئت میں پہنچیں ہیں۔ اس نظریہء ارتقاء کے دریافت کی ابتدأ اٹھارویں صدی عیسوی میں ہوئی، جس میں کہا گیا کہ دنیا میں موجودہ اشیاء کی ہیئت ابتدأ میں بالکل مختلف تھی۔ اشیائے کائنات، آہستہ آہستہ ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی، آج کی تکمیلی شکل میں پہنچی ہیں۔ قرآن سے ہی ہمیں راہنمائی ملتی ہے کہ:

اِنَّهٗ هُوَ یُبْدِئُ وَیُعِیْدُ ﴿۱۳﴾ (85:13)

وہ (خدا) ہر شے کی پیدائش کا، ایک پست ترین نقطہ سے آغاز کرتا ہے، اور پھر مختلف ارتقائی مراحل میں سے گزار کر، شے کو نقطہء تکمیل تک پہنچا دیتا ہے۔

اس آیت میں دو لفظ ہیں یُبْدِئُ اور یُعِیْدُ۔ ''یُبْدِئُ'' کے معنی ہیں ابتدأ کرنا ہیں، جس کی وضاحت ابھی ہم نے کی ہے۔ دوسرے لفظ یُعِیْدُ کے معنی پلٹنا، لوٹنا اور کسی چیز کو اس طرح ارتقائی گردشیں دینا ہے کہ شے اپنے معیار یعنی تکمیل تک اس طرح پہنچ جائے کہ جس کے بعد مزید ارتقائی گردشوں کی ضرورت نہ رہے۔ ہم اس کو شے کی آخری منزل کہیں گے، جہاں آگے مزید ارتقائی گردشیں ختم ہو جائیں۔ لہذا گردشوں کے اختتام سے ارتقاء کی لامتناہیّت کا تصوّر بھی ختم ہو جائے گا، ورنہ ایک اور مشکل پیدا ہو جاتی کہ جہاں شے کی ابتدأ معلوم نہ تھی وہاں شے کا ارتقاء ابدی ماننا پڑتا۔ صفتِ ابتدأ و انتہا صرف خدا کی ذات کے لئے ہے۔ شے یعنی مخلوق کو ابتدا میں تو آنا ہے، لیکن اس کے بعد اس کی معاد یعنی تکمیل کی انتہا بھی ہے، جس میں اُسے پہنچنا ہے۔

4۔ عالمِ امر میں اللہ کا نظریہ ارتقاء کی بنیاد پر ربوبیتِ عامہ کا قانون:

قرآن میں اللہ نے اپنے مخصوص عمل کے میدان میں امورِ قانونِ تخلیق میں یہ اصول وطریقہ کار بتایا ہے کہ:

يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (32:5)

اللہ کے عالمِ امر میں ایک اسکیم سامنے آتی ہے، جس میں اُس کے تکمیلی السماء کے مراحل طے ہوتے ہیں۔ اسکیم کا آغاز ، اُس کے پست ترین نقطہ ارض سے ہوتا ہے۔ اور اسکیم اُس السماء کے طے شدہ نقطہ تکمیل کی طرف عروج کرتی جاتی ہے۔ عروج کی اِن منازل میں ایک یوم کی مدّت تُمہارے (یعنی اِنسانی) حساب وشمار کے مطابق ہزار ہزار سال کی ہوتی ہے۔

متقدمین کے مفسرین میں سے ایک مستند مُفسر اِبنِ کثیر نے اس کا مفہوم یوں بیان کیا ہے کہ

''وہ (خدا) آسمان سے زمین کی طرف کاموں کی تدابیر اُتارتا ہے۔ پھر ایک ہی دن میں اس کی طرف چڑھ جاتا ہے جس کا اندازہ تمہاری گنتی کے ایک ہزار سال کے برابر ہے۔''

قرآن نے اِس آیت میں دیکھا جاسکتا ہے کہ اِنسانی تخلیق کے پانچ درجات کا ذکر یوں کیا گیا ہے کہ

1۔ خدا کا طریقِ تخلیق یہ ہے) کہ اِس کے عالمِ امر میں ایک اسکیم فیصلہ کے لئے سامنے آتی ہے (يُدَبِّرُ الْاَمْرَ)

2۔ اور اسکیم کے تکمیلی مراحل (مِنَ السَّمَآءِ) طے ہوتے ہیں۔

3۔ اسکیم کا آغاز، اُس کے پست ترین نقطہ (اِلَى الْاَرْضِ) سے کرتا ہے

4۔ اور اسکیم اُس طے شدہ نقطۂ تکمیل (السماء) کی طرف نظریہ ارتقاء کے قانون کے ماتحت عروج کرتی جاتی ہے (يَعْرُجُ اِلَيْهِ)۔

5۔ اِرتقائی منازل کی ایک یوم کی مدّت تمہارے حساب وشمار کے مطابق ہزار ہزار سال کی ہوتی ہے (فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ)۔

قرآن کے اِن تدریجی مراحل کا تفصیلی جائزہ لینے سے پہلے بہتر ہوگا کہ اِس آیت میں درج اہم الفاظ کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم کو سامنے لایا جائے۔ اِن کے مفہوم میں ہی ہمیں بغائر مطالعہ سے قرآنی نظریہ ارتقاء کا بیان ہی واضح ہوتا نظر آتا ہے۔

1۔ اِس آیت کے پہلے يُدَبِّرُ الْاَمْرَ کے مرحلہ میں دبر کے لغوی بنیادی معنی کسی شے کے آخر تک، نقطہ تکمیل تک کی جو حالت ہے، اُس کو سامنے رکھ کر فیصلہ کا شروع کرنا ہوتے ہیں۔ الامر سے مراد عالم امر ہے جس کے قرآن کے اصطلاحی مفہوم سے پچھلے باب میں ہم آگاہی حاصل کر چکے ہیں۔ عالمِ امر صرف ذات باری تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے اور کوئی مخلوق اس کا اِدراک نہیں کرسکتی، کیونکہ یہ خدا کی تخلیقِ کائنات کی پلاننگ اسکیم ہے۔ عالم امر میں تدریجی بات نہیں ہوتی بلکہ اسکیم یا شے کا پہلے ہی سے درجہء کمال کا فیصلہ طے کیا ہوتا ہے۔ تخلیق کے بعد اسکیم یا شے بتدریج اوپر اُٹھتی ہوئی اپنے درجہء کمال کی طرف جاتی ہے اور ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے عالمِ امر میں مرتب شدہ تکمیل کے درجہِ کمال تک پہنچ جانے کے قابل ہوتی ہے۔

2۔ آیت کے دوسرے مرحلہ میں سماء کے معنی آسمان اور ارض کے معنی زمین لئے جاتے ہیں۔ راغب نے وضاحت کی ہے کہ بنیادی طور پر سماء بلندی کو کہتے ہیں اور ارض پستی کو کہتے ہیں۔ لفظ السماء کی بھی تصریح راغب کی لغات میں یوں ملتی ہے کہ ہر شے کے بالائی حصہ کو سمَاء کہا جاتا ہے۔ اس میں ارض کی وضاحت بھی یوں ہو جاتی ہے کہ ہر سماء اپنے ماتحت ارض کے لحاظ سے سماء ہے لیکن سماء اپنے سے مافوق کے لحاظ سے ارض کہلاتا ہے۔ لہذا یہاں اِس آیت میں ''یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ'' میں کہا گیا ہے کہ خدا پہلے ایک اسکیم کی تدبیر کرتا ہے، اور وہ اسکیم بلندی کے اوپر طے ہوتی ہے یعنی تخلیق سے پہلے، اسکیم کا تکمیلی نقطہ طے ہوتا ہے۔

3۔ تکمیلی منزل کے طے ہو جانے کے اُس کی تخلیق کا آغاز اِلی الارض کے تیسرے مرحلہ میں اُسے ارض کے پست درجہ سے شروع کیا جاتا ہے۔ آگے جا کر یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اُسے مُضمِر/خوابیدہ شکل میں خلق کیا ہوتا ہے اور اُسے اِنسانی کاوشوں ہی سے جگایا/بارز کرایا جاتا ہے۔

4۔ چوتھے مرحلہ میں آیت کا اگلا حصہ ہے ''ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْہِ'' ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ شے کا پست ترین یعنی ارض سے آغاز کر کے بلندیوں (السَّمَآء) کی طرف عروج کرتا ہے۔ یہاں لفظ یَعرُجُ کے معنی ہوتے ہیں کہ سیڑھیوں کے ذریعے اوپر چڑھنا، یعنی بتدریج، درجہ بدرجہ، بلند ہونا۔ اِسی مادہ سے لفظ معراج سیڑھی ہوتے ہیں، یعنی یہ شے یکلخت کسی کو بلند نہیں کرتی بلکہ بتدریج ارتقائی منازل طے کرواتی ہوئی بلند کرتی ہے۔ ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْہِ میں ''ہ'' کی ضمیر مذکّر ہے، اس لئے ''ہ'' السمآء مؤنث کے لئے نہیں آسکتی۔ یَعْرُجُ لفظ کے بعد اِلیہِ میں یہ اِلیٰ جو ہے وہ سمت کی طرف اشارہ ہوتا ہے اور الیہ کی اِس ''ہ'' نے بات واضح کر دیا ہے کہ یہ سمت سماء کا وہ پلند نقطۂ تکمیل ہے، جو اُس کے لئے طے کیا گیا تھا۔

5۔ پانچویں اور آخری مرحلہ میں سائنس کے انکشافات یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ زندگی کا نقطۂ آغاز پہلے جرثومہء حیات اور قرآن کی زبان میں نفس واحدہ سے ہوا ہے۔ ہزار ہا سال میں موانعات پر قابو پاتے ہوئے ارتقاء کا کہیں ایک مرحلہ طے کرتے ہوئے جرثومہء حیات ایک طویل عرصہ کے بعد، آگے بلندی کی طرف یعنی اپنے تکمیلی نقطے کی طرف بڑھتا ہے۔ آگے بڑھنے کے لئے قرآنِ کریم نے یہ بات کہی ہے کہ ہر شے کے راستے میں موانعات آتے ہیں، جن کے ساتھ ٹکراؤ ہوتا ہے۔ جو شے موانعات سے ٹکراؤ میں غالب رہتی ہے، وہ زندہ رہتی ہے۔ جب راستے کے موانعات مغلوب کر دئے جاتے ہیں، تو شے کی رفتار بہتر ہوتے ہوئے آگے تیزی سے بڑھتی ہے۔ یہ اصول ذات کی حامل اِنسانی زندگی سے قبل کی زندگی میں از خود قانونِ فِطرت سے مجبوری کی حالت میں لاگو ہو جاتا ہے، لیکن اِنسانی ذات میں خود اِنسان کو موانعات کو دور کرنے کے لئے اِس کی اہلیت وصلاحیت پیدا کرنے پر لاگو ہوتا ہے۔

یہ اصول ذات کی حامل اِنسانی زندگی سے قبل کی زندگی میں از خود قانونِ فِطرت سے مجبوری کی حالت میں لاگو ہو جاتا ہے،

لیکن اِنسانی ذات میں خود اِنسان کو موانعات کو دور کرنے کے لئے اِس کی اہلیت وصلاحیت پیدا کرنے پر لاگو ہوتا ہے۔ اِس ضِمن میں قرآن اِرتقائی منازل تک رسائی کے حصول کے لئے ایک اِنسانی ذات کے لئے اصولی قانون متعارف کرا رہا ہے کہ

يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ ۚ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ (13:39)

''اللہ اپنے قانونِ مشیت کے مطابق جسے چاہتا ہے مٹا دیتا ہے، اور جسے چاہتا ہے باقی رکھتا ہے۔ اور یہ سب کچھ اُس اُم الکتاب میں محفوظ ہے۔''

اِس سے یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ جو شے، (قوم یا نظریہء زندگی یا نظامِ حیات) قانون خداوندی کی میزانِ مشیتِ میں باقی رہنے کے قابل نہ رہے، تو وہ مٹ جاتا ہے، اور جو اپنے آپ کو قانون خداوندی کی میزانِ مشیتِ میں، محکم و استوار ثابت کردے، وہ باقی رہتا ہے اور یہ محو وثبات ان اصولوں اور قوانین کے مطابق ہوتا ہے، جو تخلیق کائنات کے ساتھ ہی اللہ نے عالم امر میں مقرر کر دیئے تھے۔ قرآن نے خود ہی مٹانے اور باقی رکھنے کی اللہ کی مشیت کے اصول کی وضاحت بھی کر دی ہے کہ:

وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ؕ (13:17)

جو نظریہ/عمل بھی نوعِ اِنسانی کو فائدہ پہنچائے، وہی باقی رہتا ہے۔

باقی رہنے والا ہی قائم ودوام سے مزید ارتقاء کا حامل ہے۔ یہی الحق ہے اور اللہ کا قانون ہے کہ

وَيَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ ؕ (42:24)

''اللہ باطل کو مٹا دیتا ہے اور حق کو اپنے قانون کے مطابق قائم رکھتا ہے۔''

اِس بات کی مزید زوردار انداز میں یہاں کے علاوہ دوسرے مقام پہ تصدیق بھی کر دی کہ

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ؕ (21:18)

ہم باطل کے سر پر حق کی ضرب لگاتے چلے جاتے ہیں، تا آنکہ حق، باطل کا بھیجا توڑ دیتا ہے۔

حق کوئی نظری یا ذہنی بات نہیں ہے کہ کسی کو نہ نظر آئے اور نہ ہی محسوس ہو، اور پھر بھی آپ، اپنے آپ کو حق پہ سمجھ کر خود فریبی میں مبتلا ہو جائیں۔ قرآن کریم کا ایک کلیہ ہے کہ حق اور باطل کی کشمکش کا سلسلہ اس کائنات میں طبیعی قوانین کی رو سے از خود جاری ہے۔ اِنسانی دنیا میں یہ نہایت سُست رفتار سے جاری ہے اور وہ اِنسانی مساعی سے تیزی پکڑ لیتا ہے۔ یہ کلیہ آج سے 1400 قبل قرآن نے بیان کیا جو آج کے معرکۃ الارا نظریہء ارتقاء کی بنیاد بنا۔

نظریہِ ارتقاء کے اِس گوشہ کے انکشاف کی وضاحت ہمیں ڈاکٹر محمد رفیع الدین نے اپنی تصنیف میں یوں فراہم کی ہے کہ

''خدا کے امر کی ممکنات کا ظہور رفتہ رفتہ اپنے کمال کو پہنچتا ہے، بالکل اسی طرح جس طرح ایک بیج رفتہ رفتہ اپنی ممکنات کا اظہار کرتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک کامل درخت بن جاتا ہے۔ گویا اِس آیت کے یُدبّرُ الامر میں ارادہ اور امر کے بعد ایک

تدبیر امر کا عمل ہوتا ہے، جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ ہر شے کی ربوبیت سے تمام ارتقائی مدارج سے گزار کر اس کو کمال کے درجہ تک پہنچاتا ہے، جو خالق کے ذہن یا ارادے میں بوقت تخلیق پوشیدہ ہوتا ہے۔

نظریہ ارتقاء کے اِس گوشہ کے انکشاف کی وضاحت ہمیں ڈاکٹر محمد رفیع الدین نے اپنی تصنیف میں یوں فراہم کی ہے کہ

''خدا کے امر کی ممکنات کا ظہور رفتہ رفتہ اپنے کمال کو پہنچتا ہے، بالکل اسی طرح جس طرح ایک بیج رفتہ رفتہ اپنی ممکنات کا اظہار کرتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک کامل درخت بن جاتا ہے۔ گویا ارادہ اور امر کے بعد ایک تدبیر امر کا عمل ہوتا ہے، جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ چیز کی ربوبیت کرتا ہے اور اسے تمام ارتقائی مدارج سے گزار کر اس کے کمال تک پہنچاتا ہے۔

عالمِ امر کے نظریاتی طور پر نظریہ ارتقاء کا قانون کے متعین کرنے کی یہاں عمومی حقیقت بیان کی گئی ہے۔ اِس نظریاتی عمومی قانون کے اِنسانی زندگی کی تخلیق پر عملی اِطلاق کی صورت میں دیکھا جاتا ہے کہ حیاتِ اِنسانی اپنے قبل بھی مرحلہ وار ارتقاء کی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔

6۔ قرآن میں انسانی زندگی کے قبل مرحلہ وار ارتقائی تخلیق کے سلسلہ کی وضاحت:

حیاتِ انسانی کی تخلیق کے ارتقائی مرحلہ پر قرآن کریم ہی میں وضاحت کی گئی ہے کہ:

وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ (32:7)

''انسان کی پیدائش کی ابتداء طین سے ہوئی''۔

یہ چمکنے والی ایک بھربھری سی، ریتلی سی، مٹی ہوتی ہے، وہ بھی ایسی جو ایک دوسرے کے ساتھ چپک جائے۔ قرآن نے اِس کی وضاحت کی کہ:

اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِیْنٍ لَّازِبٍ (37:11)

ہم نے پیدائش کی ابتداء چپک جانے والی مٹی سے کی''۔

دوسرے مقام پر غیر جاندار مادہ سے زندگی کی نمود کی ابتداء پانی سے کرنے کی وضاحت کرتے ہوئے بیان کیا کہ

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ ؕ (21:30)

''ہر زندہ شے کی نمود پانی سے ہوئی ہے''۔

پانی اور مٹی ملتی ہے، تو طین لازب بنتی ہے۔ مٹی میں زندگی نہیں ہوتی، البتہ کچھ غیر جاندار نمکیات و معدنیات ہوتی ہیں۔ طین کہنے سے مراد اس کے نمکیات و معدنیات ہیں۔ آگے طین لازب چپکتی مٹی آ گئی۔ یہ سائنس کی تحقیق کے مطابق وہ ہے جو سمندر کے کنارے پانی کے مٹی کے ساتھ ملنے سے وجود پذیر ہوتی ہے۔ جب پانی سے ملی مٹی کے اندر نمکیات اور معدنیات پر سورج کی روشنی و حرارات پڑی تو مٹی میں خمیر اُٹھنے سے پھر وہ چکنی مٹی بنتی ہے، جسے طینِ لازب چپچپی مٹی کہتے ہیں، اس مٹی

میں سے پہلا جرثومہء حیات ابھرا۔ یہ جرثومہء حیات ننگی آنکھ سے دیکھا نہیں جا سکتا، اس کو خوردبین سے دیکھنا پڑتا ہے۔ نظریہ ارتقاء یعنی زندگی کا ابھرنا یہاں سے شروع ہوا۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ﴿۱۴﴾ (55:14)

یہ مٹی کا وہ مرحلہ ہے، جس میں مٹی پانی سے مل کر پھر سورج کی حرارت سے خشک ہو کر، پکائی ہوئی جیسی ہو جاتی ہے، اور وہ مٹی کھنکنے لگتی ہے۔

قرآن کریم نے اسی پکی ہوئی مٹی کے لئے لفظ فخار استعمال کیا ہے۔ فخار سے پہلے ''ک'' ہے، کَالْفَخَّارِ یعنی بالکل پکی ہوئی نہیں بلکہ اس کی مانند۔ قرآن نے طین کہا، پانی کہا، اس سے طین لازب بنایا، حرارت ملنے پر یہ مٹی فخار ہوئی۔ یہ ہے اس وقت تک کی تحقیق جو آپ کے ہاں ہوئی ہے۔ یہ نہیں کہ پھر مٹی کا پتلا بنایا گیا۔

اگر قرآن نے مٹی بھی کہا ہے، تو دوسرے مقام پہ کہا کہ:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ﴿۱۲﴾ (23:12)

''ہم نے انسان کی تخلیق کی ابتداء، بے جان مٹی کے خلاصہ سے کی''۔

مٹی کے خلاصے کو سمجھنے کے لئے ایک بیج مٹی میں دبایئے۔ سب سے پہلے بیج کی جڑیں زمین میں پھیلیں گی، اور پھر چند دنوں میں، بیج کی کونپل زمین سے باہر آ جائے گی۔ کونپل اور پھر بعد میں درخت بننے پر آپ دیکھیں گے کہ اس میں مٹی کہیں نہیں ہے۔ بیج کی نشوونما مٹی کے نمکیات و معدنیات یعنی مٹی کے خلاصے سے ہوئی۔ بیج کی جڑیں، پانی کے ذریعے نمکیات و معدنیات یعنی مٹی کے خلاصے کو جذب کر کے، کونپل اور پھر پورے درخت میں پہنچاتی ہیں، جس سے پودے کی نشوونما ہوتی ہے۔

وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ﴿۱۷﴾ (71:17)

''اور اللہ نے تمہیں زمین سے سبزہ کے طور پر اُگایا''

یعنی زندگی کے یہ جراثیم مختلف نوعوں میں تقسیم ہو کر ایک درخت کی شاخوں کی طرح بڑھنے پھولنے لگے۔ سلسلہ ارتقاء کے ماہرین جب مختلف انواع حیات کو سمجھاتے ہیں تو وہ اسے درخت کی شکل میں ہی پیش کرتے ہیں۔ قرآن انسانی تخلیق کی اِبتدا میں سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ کی وضاحت میں قرآن کہتا ہے کہ ہم نے، زمین کے خلاصے سے، سب سے پہلے نفس واحدہ کی تخلیق کی۔ اُس سے پہلے کے ارتقائی منازل میں سائنس کے انکشافات نے یہ چیز بتائی ہے کہ جب زندگی مختلف مراحل طے کرتی ہوئی، آگے بڑھی ہے تو یہ حیوانات کی ارتقاء یافتہ شکل میں بن مانس تک پہنچ گئی، جس کے بعد انسانی پیکر آتا ہے۔ اب تک ان کی تحقیق یہ ہے کہ حیوان اور اِنسان کے درمیان میں بھی ایک گمشدہ کڑی ہے یعنی ارتقاء کی ایک کڑی ایسی ہے، جو ابھی تک سامنے نہیں آ سکی۔ اس کے متعلق جاننے کے لئے مفکرین بڑی کاوش اور تحقیق کر رہے ہیں، لیکن اس گمشدہ کڑی

کا ابھی تک سراغ حاصل نہیں کر سکے۔ قرآن کریم نے اِس کڑی کو نگاہوں سے اوجھل ہونے کی نسبت سے ''جنّ'' یا ''الجآن'' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے کہ:

وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ (15:27)

''انسان سے قبل الجآن نامی مخلوق کو آگ کی لپٹ سے پیدا کیا''۔

اس مخلوق کو الجّ ان کا نام دیا گیا ہے اور وہ اِنسانی عِلم سے ابھی تک اجنبی اور گمشدہ ہے اور اُس کا کائنات کے ساتھ کوئی تعلق نہیں، اِسی لئے اُس کے جاننے کے سراغ میں تیزی دکھائی نہیں دیتی۔

سائنس کے انکشاف کے مطابق زندگی کی ابتداء کا پہلا لائف سیل نر اور مادہ کا مجموعہ تھا۔ اسے قرآن کریم نے نفس واحدہ کہا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ پھر ہم نے اس کو دو ٹکڑوں میں بانٹ دیا۔ سائنسدانوں کے نظریہء ارتقاء کے مطابق زندگی کی نمود جہاں سے ہوئی وہ زندگی کا پہلا جرثومہء حیات تھا۔ یہ جرثومہ حیات بغیر طاقت ور مائیکروسکوپ کے دیکھا نہیں جا سکتا۔ یہ جرثومہء حیات ہر وقت متحرک رہتا ہے۔ سائنس کے انکشافات کے مطابق رحم مادر میں، زندگی کا جو جرثومہ قرار پکڑتا ہے، وہ وہی اوّلین جرثومہء حیات ہوتا ہے، جو مٹی اور پانی کے امتزاج سے پیدا ہوا تھا، اور جس نے اربوں سال کے ارتقائی مراحل طے کر کے حیوانی / انسانی پیکر اختیار کیا، اور پھر جنسی اختلاط تک پہنچا۔ اب انسان کی رفاقت سے، یا دیگر جانداروں کی رفاقت سے، زندگی کا جرثومہ رحم مادر میں، اربوں سالوں کے وہ تمام مراحل صرف چند ماہ میں طے کر کے اِنسانی پیکر اختیار کر لیتا ہے۔ یہ جرثومہ، رحم مادر میں، ان تمام مراحل سے گزرتا ہے، جو اس نے اس سے پیشتر از خود کروڑوں اربوں سالوں میں طے کیے تھے۔ اب جنسی اختلاط کے بغیر زندگی کی کوئی شاخ آگے نہیں بڑھ سکتی۔ جنسی اختلاط سے ولادت کے لئے، خدا کا قانون یہ ہے کہ جب تک مرد و عورت یا نر و مادہ کا اختلاط نہیں ہوگا، بچہ پیدا نہیں ہوگا۔

اِس باب میں نظریہِ ارتقاء کے قرآنی نظریہ کے سامنے آنے کے بعد ہم دیکھیں گے کہ قانونِ ارتقاء کی روشنی میں اِنسانی زندگی کی تخلیق کی دریافت میں زمانہِ قدیم سے ہمارے مفکرین بھی مشغول رہے ہیں۔ حکمائے مغرب کے نزدیک ارتقاء کا وسیع ترین مفہوم یہ ہے کہ کسی شے کی چھپی توانائی یا قوت کا کسی مقصد کی جانب بڑھنا، بالقوت کا بالفعل ہو جانا اور ظاہری پیچیدہ شکلوں کا ظاہری سادہ شکلوں سے نشوونما پانا، جیسے بیج کا ارتقا درخت کی صورت میں ہوتا ہے۔ ڈارون اور سپنسر جب لفظ ''ارتقاء'' استعمال کرتے ہیں تو اس میں نشوونما کا مفہوم بھی شامل ہے۔ مگر یہ امر واضح رہنا چاہیے کہ نشوونماء میں نئی اشکال کی پیدائش نہیں ہوتی بلکہ جو کچھ موجود ہوتا ہے اس کا لازمی نتیجہ برآمد ہوتا ہوتا ہے۔ اِس میں ہم نے دیکھا کہ درحقیقت خالقِ کائنات اس تمام کارگہِ ہستی کو طبیعی قوانین کے مطابق چلا رہا ہے، جن کی رو سے ایک جرثومہ حیات مختلف ارتقائی مراحل طے کر کے پیکر انسانی تک پہنچا ہے۔

قرآن حکیم کے طالب علموں کے لیے خوشخبری

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے سات سو سے زائد دروسِ قرآنی پر مبنی تفسیری سلسلہ کے تحت ادارہ طلوع اسلام لاہور کی طرف سے مندرجہ ذیل تفسیری کتب کی اشاعت الگ الگ جلدوں میں ہو چکی ہے۔ یہ جلدیں 20x30/8 کے بڑے سائز کے بہترین کاغذ پر خوبصورت طباعت اور مضبوط جلد بندی کے ساتھ دستیاب ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ	نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ
سورہ الفاتحہ	(1)	240	200/-	سورۃ الانبیآء	(21)	336	300/-
سورہ الفاتحہ (سٹوڈنٹ ایڈیشن)	(1)	240	110/-	سورۃ الحج	(22)	380	350/-
سورۃ البقرہ (اول)	(2)	500	400/-	سورۃ المؤمنون	(23)	408	400/-
سورۃ البقرہ (دوم)	(2)	538	400/-	سورۃ النور	(24)	264	350/-
سورۃ البقرہ (سوم)	(2)	500	400/-	سورۃ الفرقان	(25)	389	350/-
سورہ آل عمران (اول)	(3)	472	500/-	سورۃ الشعرآء	(26)	454	400/-
سورہ آل عمران (دوم)	(3)	480	500/-	سورۃ النمل	(27)	280	300/-
سورۃ النساء	(4)	870	700/-	سورہ القصص	(28)	334	350/-
سورۃ المائدہ	(5)	450	500/-	سورہ عنکبوت	(29)	388	350/-
سورۃ الانعام	(6)	600	600/-	سورہ روم، لقمان، السجدہ	(30,31,32)	444	400/-
سورۃ الاعراف (اوّل)	(7)	480	500/-	سورہ احزاب، سبا، فاطر	(33,34,35)	570	400/-
سورۃ الاعراف (دوم)	(7)	400	500/-	سورہ یٰسین	(36)	164	150/-
سورۃ انفال	(8)	210	250/-	سورہ الصّٰفّٰت، ص، زمر	(37,38,39)	450	400/-
سورہ توبہ	(9)	530	550/-	سورۃ مومن، حٰمٓ سجدہ، سورہ شوریٰ	(40,41,42)	624	550/-
سورۂ یونس	(10)	360	400/-	سورۃ زخرف، دخان، جاثیہ، احقاف، محمدؐ	(43-44-45 46-47)	520	500/-
سورۃ ھود	(11)	400	400/-	سورۂ الفتح، الحجرات، ق، الذاریات، الطّور، النجم	(48-49-50 51-52-53)	550	500/-
سورۃ یوسف	(12)	288	300/-	سورۂ القمر، الرحمٰن، واقعہ، الحدید	(54-55 56-57)	384	400/-
سورہ رعد، ابراہیم، الحجر	(13-15)	500	500/-	28 واں پارہ (مکمل) مجادلہ، حشر، ممتحنہ، صف، جمعہ، منافقون، تغابن، طلاق، تحریم	(58-59-60-61-62-63-64-65-66)	300	300/-
سورہ النحل	(16)	334	300/-				
سورہ بنی اسرائیل	(17)	396	400/-	29واں پارہ (مکمل)	----	544	400/-
سورۃ الکہف وسورہ مریم	(18-19)	532	500/-	30واں پارہ (مکمل)	----	624	400/-
سورہ طٰہٰ	(20)	416	350/-	شرح جاوید نامہ	----	800	1000/-

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان) فون نمبر: +92 42 3571 4546 +92 321 4460 787

بزم ہائے طلوع اسلام اور تاجر حضرات کو ان ہدیوں پر تاجرانہ رعایت دی جائے گی۔ ڈاک خرچ اس کے علاوہ ہوگا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بچوں کا صفحہ

نئے پڑوسی

نثار صاحب اور سرمد صاحب ایک دوسرے کے پڑوسی تھے۔ دونوں ایک ہی مکان کے دو حصوں میں رہتے تھے۔ اِن کا آپس میں سلوک اتنا اچھا تھا کہ لوگ انہیں دیکھ کر کہتے تھے کہ یہ کتنے اچھے پڑوسی ہیں۔

سرمد صاحب کے گھر اگر زیادہ مہمان آجاتے تو نثار صاحب کی بیوی آکر کھانا پکانے میں مدد کر دیتی۔ نثار صاحب کی چھوٹی بیٹی کبھی اپنی امی یا ابو سے ناراض ہوتی تو سیدھا سرمد صاحب کے گھر آتی اور آتے ہی اپنی توتلی زبان میں کہتی:

''چاچی، چاچی! میں آپ تی بیٹی ہوں۔ میں امی تے گھل نہیں جاؤں گی۔''

یہ دو گھرانے ہنسی خوشی زندگی گزار رہے تھے۔ دو تین سال یوں ہی گزر گئے پھر نثار صاحب کا تبادلہ کراچی ہو گیا۔ سرمد صاحب، ان کی بیگم اور بچوں کو بہت افسوس ہوا۔

نثار صاحب کے مکان میں نئے کرایہ دار آگئے۔۔۔ یہ تھے اکمل صاحب۔۔۔ ایک وہ۔۔۔ ایک ان کی بیوی اور ایک بچی۔۔۔!

سرمد صاحب اپنی بیوی کے ساتھ نئے پڑوسیوں سے ملنے گئے مگر وہ لوگ بڑے لاپروا ہو کر ملے۔ سرمد صاحب کی بیگم نے گھر آکر سرمد صاحب سے یہ بات کہی لیکن ان کا دل بہت بڑا تھا۔ بولے:

''بھئی ممکن ہے کہ وہ لوگ کسی وجہ سے پریشان ہوں۔۔۔ ویسے بھی یہ تو ہمارا فرض تھا۔۔۔ ہر آدمی کو اپنا کام کرنا چاہیے۔ دوسرا کیا کرتا ہے ہمیں اس سے کیا۔''

دن گزرتے چلے گئے۔ اکمل صاحب یا ان کی بیگم ایک بار بھی سرمد صاحب کے گھر نہ آئے۔ سرمد صاحب ہی راہ چلتے اکمل صاحب کو سلام کر لیتے مگر اکمل صاحب نے کبھی پہل نہ کی۔۔۔ بھلا ایسی باتوں کا اثر کب تک نہ ہوتا۔ سرمد صاحب اور ان کی بیوی نے بھی اپنے نئے پڑوسیوں سے بات کرنی چھوڑ دی۔

رمضان شریف کا مہینہ آیا۔ یہ مہینہ برکتوں اور رحمتوں کا مہینہ ہوتا ہے۔ اس سے بڑی برکت اور کیا ہوگی کہ اللہ تعالیٰ نے اسی مہینے میں اپنی آخری کتاب ''قرآن مجید'' ہمارے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اتارنی شروع کی تھی۔

ایک دن عصر کی نماز کے بعد سرمد صاحب قرآن مجید پڑھ رہے تھے تو دیکھا کہ یہ حکم تھا:

''اپنے والدین کے ساتھ اچھی طرح پیش آؤ، اور اپنے پڑوسیوں کے ساتھ چاہے وہ رشتہ دار ہوں یا اجنبی۔''

سرمد صاحب سوچنے لگے کہ میں اپنے پڑوسیوں کے رنگ ڈھنگ سے ایسا تنگ آیا کہ قرآن شریف کا یہ حکم بھی بھول گیا۔ اپنی بیگم کو فوراً آواز دی اور کہا:

''آج افطاری کے لیے جو کچھ پکایا ہے اور بازار سے جو پھل آئے ہیں ان میں سے کچھ اکمل صاحب کے گھر بھی بھیج دو۔''

بیگم سرمد نے دو تین تھالیوں میں سب چیزیں رکھ کر اکمل صاحب کے گھر بھیج دیں۔ وہ لوگ بھی روزہ کھولنے کی تیاری کر رہے تھے۔ اس بات کا ان کے دل پر اثر ہوا اور سوچنے لگے کہ اگر عبادت سے دل نہ بدلیں اور ہم زیادہ اچھے مسلمان اور انسان نہ بنیں تو ایسی عبادتوں کا کیا فائدہ۔

یہ سوچ کر وہ شرمندہ ہوئے اور دوسرے دن صبح ہی صبح اکمل صاحب نے سرمد صاحب سے کہا:

''بھائی صاحب! آج آپ اور بھابھی ہمارے گھر روزہ افطار کریں اور ہاں! اپنے بیٹے اور بیٹی کو ضرور ساتھ لانا۔''

اس دن سے ان دونوں گھرانوں کا آپس میں ملنا بڑھ گیا۔ قرآن مجید کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے نے دو گھرانوں کے تعلقات کو کیسا اچھا بنا دیا۔ اگر ہم قرآن مجید کی سب باتوں پر چلنے لگیں تو زندگی کیسی پیاری پیاری ہو جائے گی۔

راستے کی خطرناک گھاٹیاں

راستے کی خطرناک گھاٹیوں سے آگاہ کرتے ہوئے مفکرِ قرآن نے کہا: لیکن عزیزانِ من! اس سفر میں ایک گھاٹی ایسی بھی آتی ہے۔ جہاں کوئی باہر کا رہزن، ڈاکہ زنی نہیں کرتا۔ خود اپنے اندر کا چور کمین میں چھپا ہوا ہوتا ہے۔ یہ گھاٹی ایسی ہے جہاں سے پاؤں پھسلے تو انسان سیدھا جہنم کے عمیق غاروں میں جا گرتا ہے اور وہ گھاٹی یہ ہے کہ آپ اس سلسلہ میں جو کچھ کریں اس میں کسی دنیاوی اجر و معاوضہ کا خیال تو ایک طرف، نمود و نمائش کا شائبہ تک بھی نہ آنے پائے، کہ یہ وہ شرک کی چنگاری ہے جو سب متاعِ عمل کو جلا کر خاکستر بنا دیتی ہے۔ قرآنِ کریم نے اس عظیم حقیقت کو بڑے بصیرت افروز انداز سے بیان کیا ہے جب کہا ہے کہ: اِنۡ اَحۡسَنۡتُمۡ اَحۡسَنۡتُمۡ لِاَنۡفُسِکُمۡ ۟ (17:7) تم کوئی اچھا کام کرتے ہو تو وہ کسی دوسرے کے لئے نہیں، بلکہ خود تمہاری بھلائی کے لئے ہوتا ہے۔ وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ خَیۡرٍ فَلِاَنۡفُسِکُمۡ ؕ (2:272)۔ جو کچھ تم بظاہر دوسروں کو دیتے ہو وہ درحقیقت خود اپنے آپ کو دیتے ہو۔ اب آپ سوچئے کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تم ایک مکان اپنے لئے بناؤ اور اس کا احسان اہل مکہ کے سر دھرو۔ تم کھانا خود کھاؤ اور اس کے شکریہ کے متمنی اپنے دوست سے ہو۔ یہی کیفیت اس ___ کام کی ہے جسے آپ قرآنی تحریک کے لئے کرتے ہیں۔ خواہ وہ مالی خدمت ہو یا صرف محنت، یا ایثارِ وقت۔ اگر آپ یہ سمجھ لیں کہ یہ سب کچھ آپ اپنے لیے کرتے ہیں تو پھر آپ کے دل میں کسی اجر و معاوضہ کی تمنا یا صلہ و ستائش کی آرزو پیدا نہیں ہوگی۔ لیکن اگر اس سے آپ کے دل میں اس قسم کا کوئی جذبہ بیدار ہوتا ہے تو سمجھ لیجئے کہ وہ ابلیس کا افسوں ہے جس سے وہ آپ کے اعمال کو رائیگاں بنا رہا ہے۔ انسان تو ایک طرف، قرآنی ذہنیت تو اپنے خدا سے بھی یہ کہتی ہے کہ ؎

شانِ عطا کو تیری عطا کی خبر نہ ہو
یوں بھیک دے کہ دستِ گدا کو خبر نہ ہو!

(پرویزؒ، سالانہ کنونشن، 9 تا 12 نومبر 1967ء)

Is Sexual Relationship a Private Matter?

By G. A. Parwez
(Translated by: Mansoor Alam)

In the May-June 1982 issue of Tolu-e Islam magazine I published an article entitled, "Aurat Quran Ke Aayinay Mein," i.e., "The Women in the Light of the Quran" in which protection of chastity was highlighted as an extremely important aspect of this issue: Is Sexual Relationship a Private Matter?A new generation youth criticized my explanation of this issue and wanted clarification. I am emphasizing here the "new generation" because this individual is not the only one but many budding youngstershave beenasking me questions about this issue. The gist of their comments and questions is this: that sex is a natural private urge and if an adult boy and an adult girl fulfill this desire with mutual agreement then what is wrong with this; that this is a private matter between them and therefore no one should interfere in this. If the society wants to put certain conditions (e.g., in matter related to children born as a result) then this is another matter and becomes a social issue. The society is free whether or not to enforce certain conditions related to this issue like what has been done in Western countries where homosexuality is allowed by law and is not considered bad. This is what our youth say.

If the sexual relationship is indeed a private matter (or at most social issue), then men and women should have freedom for sexual relationship within the conditions imposed by the society. But if it affects not only the entire nation but the whole world then it is no longer a private matter. Then there has to be universal restrictions imposed on this engendered freedom of sexual relationship. The Quran declares this as a universal issue and that is why it calls for the protection of chastity as a universal value. Our youth are so much turned off from religion –and we are responsible for it – that they do not get satisfied with any religious arguments. On the hand, they consider only the research and investigation done by the West as evidence and proofrelated to any issue. I wrote an article thirty years ago in which I had presented the research of a Western social scientist who provided proof, after conducting extensive investigation, that sexual relationship is not an individual affair and a private matter. It has deep impact on humankind's culture and

society and on the rise and downfall of nations. This evidence is supported by the Quran. And, therefore,because of its extreme importance, I have been mentioning this regularly and written extensively about this issue.

But this issue has become so intense nowadays that I think it requires a detailed discussion. Thirty years ago,this issue affected only those that used to dive in this sexual river and therefore its impact remained limited within banks of that river. But today it has created a flood that has taken over and penetrated every town and every road and alley. In fact,this flood has entered every house. If outside literature related to this issue is pouring down in our nation like the monsoon clouds, the internal springs are oozing out from every nook and corner of the nation's land in the form of vulgar and filthy literature, poetry, music, dance, cinema, radio, television, VCR, etc. There is no pieceof land in this unfortunate nation that has not been corrupted by this filth in the name of progress. Some suggest punishment to solve this issue and some suggest that women should be home-bound. But no one thinks that an issue that affects the heart can only be solved by transforming the heart. And the heart can only be transformed by proper education and training, not by external punishment or by shutting the women inside homes.

We present below the detailed article that shows that sexual relationship is not a private matter between two individuals; but that it deeply affects the life of nations at large and has global impact.

***

Life's animal's needs

When life went through its long evolutionary process and crossed the threshold to reach higher level then it acquired some new superior attributes; but it still possessed some attributes of the lower level. Before life reached the human level it was at the animal level. Once it reached the human level it brought within itself may attributes of the animal level. These are called animal instincts and which are divided into three broad categories: Self-preservation, self-aggression, and self-procreation which is the strongest of all. Nature does not want that a species should disappear after sometime. Nature wants it to continue further, no matter how difficult and long it has to go through the process for its continuation, and no matter how hard it has to work for it.For example, please note how nature starts a plant from a small seed and then it takes it through a long process and turns the tiny seed into a giant tree. What is the goal of the tree? To produce the same seed that it started with and to continue the process through which it went through. Humans derive many benefitsfrom its wood; and nutrition and nourishment from

its fruits. Trees are absolutely necessary in regards to changing seasons and for balancing the environment conducive to sustaining life on earth. But its real goal is procreation and continuation of its species. However, in animals, the procreation happens through sexual intercourse.Since nature wants them to continue breeding, it has kept a pleasurable feeling in this process to entice them to procreate. To maintain animal life and tocontinue the evolutionary process, nature has kept what we call animal instincts within them. However, for this purpose, it is necessary that they should not be left unrestrained; that there must be control overtheiremotional instincts.In the animal world, nature has put its own control over these instincts because animals have not been given freedom of choice. So, they are duty bound to follow nature's control. For example, nature decides that a goat should only eat vegetation and a lion should only eat meat. They do not have freedom to deviate from what nature has decided for them.

Animals and their sexual instinct

Apart from food, Nature has put controls over animals as far as satisfying their sexual instincts are concerned. A bull roams among cows all the time but its sexual desire does not flare up. But as soon as the mating season starts thesexual desire flares up and becomes uncontrollable. The same thing happens to cows. They cannot suppress it because nature controls it. But once the mating season ends sexual desire disappears in them. Poet Ghalib put it beautifully:

Do not tear the flower's pocket out of season
It will happen by itself when nature signals it

Animals wait for nature's signals. When it does not come then this desire remains absent. But when the signal comes then this desire not only flares up but that animals become totally uncontrollable. Again, Ghalib puts it so superbly:

There is no power over love because it is such a unique fire
That cannot be lit and when it is lit it cannot be extinguished

Human sexual desire

But human beings have been granted freewill. Therefore, nature has not put any controls over humans to satisfy their sexual desire. But it is obvious that if there are no restrictions imposed on the need to satisfy this desire, then we know what the result would be. To explain this situation perhaps there couldn't be a better choice of words than how Allama Iqbal has put it: It is as if some mad person has entered a glassware and

chinaware store. The same thing will happen to a society in which there is no control over humans for satisfying their sexual desire.

One idea is that humans will enforce their own restrictions on themselves in the form ofhumancreated laws and regulations. But the Quran says that this technique of humans putting restrictions on this desire will never work because they cannot separate their emotions from themselves. They start thinking right away how to break these restrictions. This is a separate topic and I don't want to get into the details of this here. At this time, I just want to mention what was the result when the West put restrictions on this desire. It is as if it was only yesterday that during Queen Victoria's days, humans used to dress which covered their entire bodies. In fact, what was called leg was covered. For example, even the Piano legs were covered. Then due to various reasons things changed and a sexual revolution happened in the West and nudity became a new normal; in fact, it became symbol of cultural progress. Then changes started to take place in the laws and regulations regarding sexual intercourse. First, if unmarried adult boys and girls engaged in sex with mutual consent then it was allowed by law and the society didn't consider it wrong. However, if children were born as a result then they were called bastards and they were abhorred in the society. But slowly this also disappeared from the society and bastards were treated as normal. The Esquire magazine issue of August1957 published an article entitled "A Brief for Bastards" in which it was mentioned that bastard children are very bright and creative and most of the top level professional are bastards. As for married couples, it was considered wrong if they engaged in extra-marital affair without mutual consent. Thus the restrictions started to be lifted on sexual desires so much so that homosexuality and same-sex marriage were legalized in the West. In the entire Universe this unique distinction belongs to humans only. These thoughts cannot enter even in the worst animals. No wonder the Quran says that humans can descend to the worst levels than animals: أُولَـٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ (7:179) – They are just like animals - and indeed worse than them.At one time the word "love" was used for sacred feelings but now it is used for sex-perversion. A book was published about King Farouk of Egypt from England entitled "The Greatest Lover of the World" describing in detail the story of his illicit sexual escapades. Now one can easily see what is love and who is a lover.

The influence on new generation

These things are coming to our unfortunate country from the West and are influencing your youth. If one talks to them then their usual reply echoes the Western concept in this matter:

If the sexual gratification remains a private matter, then what right others have to interfere in this matter; thatif others are being affected, then it is societal issue and the society can impose whatever rules and regulation it wants fit; thatthe West is much more cultured and advanced than us and it has lifted many of the restrictions; and that it is a really good thing that the West has done this. Our society is still conservative and that is why we are backward in this matter just like other matters. Slowly our society will have to catch up and time will make that happen.

From this they mean that our society is in the hands of the conservatives but they will be gone after some time, and the next generation will take over and our country will then become advanced by institutingWestern rules and adopting Western culture.

From this it is clear that, to our youth, sexual relationship is a private matter and no one has the right to impose any kind of restrictions on this issue. If I wanted I could prove to them from the Quran that this assumption is wrong – that sexual relationship is a private matter and that no one has the right to interfere with this matter. But since our youth only accept Western scholars and their arguments as reliable and, to them, any Islamic argument or proof does not have any weight because they attributed it to orthodoxy and backwardness, I am going to present a prominent Western scholar's research who has provided proof that sexual relationship is not a private matter. He is the well-known Cambridge University ProfessorDr. J.D. Unwin who has presented his research in his famous book entitled,"Sex and Culture," after studying primitive societies of South America and Africa and Pacific islanders, as well as sixteen developed and civilized cultures. I am presenting several quotes from his book and I hope our youth will seriously pay attention.

The first statement of this book is:

"Among both civilized and uncivilized peoples there isa close relation between sexual opportunity and cultural condition, and I have thought it worthwhile to conduct a detailed inquiry into the matter.The results of my inquiry, and the conclusions I have drawn from thefacts, are presented in the following pages." [Page1]

Before he begins the book Dr. Unwin has written in the preface:

"Briefly stated, my final conclusion is that the cultural behaviour (asdefined) of any human society depends, first, on the inherent nature ofthe human organism, and, secondly, on the state of energy into which,as the result of its sexual regulations, the society has arrived." [Page XIV]

And he provides the final proof of his investigation:

"Otherthings being equal, however, social energy will be exhibited by

any societywhich places a compulsory limitation upon the sexual opportunity of itsmembers." [Page 320]

Please note the conclusion this research scholar arrives at after his long investigation: that sexual relationship is not just for individuals satisfying emotional instinct but that nations' cultural and social level depends on the restrictions and regulations that are placed on it. Dr. Unwin further states:

"The ideas arechanged only when the sexual opportunity of the society has been limited,new ideas being adopted according to the intensity of the compulsorycontinence which the new regulations impose."[Page 302]

He goes on to say that:

"The extension orlimitation of sexual opportunity, either in society as a whole or ina class within the society, cannot have its full cultural effect for ahundred years." [Page 326].

So, if there is a change in a nation's societal level, whether upward or downward, i.e., a nation's overall rise or fall, then one should go back to the nation's history hundred years back and observe what kind of changes it instituted in its sexual relationship – whether it restricted it or relaxed it. If it restricted it then a nation's rise will show up after hundred years. If it relaxed it then its fall will show up after hundred years.

Forced Celibacy

Christianity instituted forced celibacy for nuns. Our Sufis also practiced and promoted it by calling it spiritualism. Dr. Unwin says about celibacy in his book:

"Compulsory celibacy does notlimit sexual opportunity. It attempts to deny sexual activity. Its effectupon cultural condition is devastating." [Page 84]

Compulsory celibacy means that it is included as part of religious ideology and as cultural requirement. The idea is that this makes those who practice celibacy sacred and honorable. This way people would be encouraged to practice celibacy in order to achieve piety and respect just as nuns and clergies.

One the one hand is this belief in celibacy to achieve piety. But on the other hand is this belief that if any restrictions are placed on sexual emotion then it creates psychological disease. Dr. Unwin's research shows that this is not the case. Putting restrictions on sexual emotion does not cause psychological disease but that it happens by letting it totally uncontrolled.

"The evidence is that in the majority of cases compulsory continenceproduces social energy; only rarely does the consequent

derangement ofthe nervous system lead to what is technically called neurosis."[Preface, Page xiii]

***

Three groups

After this introduction, Dr. Unwin has classified the culture levels of uncivilized primitive tribes into three categories: 1) Deistic societies were at the highest level; 2) Manistic societies were at the lower level and 3) Zoistic societies were at the lowest level. After investigating the cultural levels of eighty primitive tribes Dr. Unwin arrived at the following conclusion:

1. All the zoistic societies permitted pre-nuptial sexual freedom; conversely, all the societies which permitted that freedom were in the zoisticcondition.
2. All the manistic societies had adopted such regulations as compelledto institute irregular or occasional continence; conversely, all the societies whichhad adopted such regulations were in the manistic condition.
3. All the deistic societies insisted on pre-nuptial chastity; conversely, all the societies which insisted on pre-nuptial chastity were in the deisticcondition. [Page 300-301]

After this Dr. Unwin discusses the code of sexual life after marriage. But before he goes into details he emphasizes the fact:

"The evidence is that post-nuptial regulations are not a productive factorunless the society insists on pre-nuptial chastity." [Page 343].

He classifies the marriage into four categories:

1. Absolute monogamy—the practice or circumstance of having one spouse at one time, but presupposing conditions whereby legally the wife is under the dominion of her husband and must confine her sexual qualities to him, under pain of punishment, for the whole of his or her life.
2. Modified monogamy—the practice or circumstance of having one spouseat one time, the association being terminable by either party inaccordance with the prevailing law or custom.
3. Absolute polygamy—the practice or circumstance of having more thanone wife at one time, these wives being compelled to confine theirsexual qualities to their husband for the whole of their lives.
4. Modified polygamy—the practice or circumstance of having more than one wife at one time, the wives being free to leave their husbands onterms laid down by law and custom.

To Be Continued

رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں رائج تھا۔ یعنی قرآن کریم کے احکام وقوانین کی اطاعت اور جن امور میں قرآن کریم نے صرف اصول دیئے ہیں ان کی چار دیواری کے اندر امت کے مشورہ سے متعلقہ امور کے فیصلے۔ اس طریق کو خلافت علیٰ منہاج رسالت کہا جاتا ہے۔

8- بدقسمتی سے خلافت علیٰ منہاج رسالت کا یہ سلسلہ کچھ عرصہ کے بعد منقطع ہو گیا اور دین کا نظام باقی نہ رہا۔ اس سے امت میں انتشار پیدا ہو گیا۔ خلافت کے زمانے میں تمام امور دین کے نظام کے تابع رہتے تھے۔ لیکن بعد میں مذہب اور سیاست میں ثنویت پیدا ہو گئی۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری ہے۔

9- ہمارے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ پھر سے خلافت علیٰ منہاج رسالت کا سلسلہ قائم کیا جائے جو امت کو احکام وقوانین خداوندی کے مطابق چلائے۔ اس نظام کی بلند ترین اتھارٹی کو مرکز ملت کہا جائے گا اور اس کی طرف سے جاری شدہ احکام کی اطاعت خدا اور رسول ﷺ کی اطاعت کے قائم مقام قرار پائے گی۔ ظاہر ہے کہ اس نظام کو چلانے والوں کی اپنی زندگی سب سے پہلے قوانین خداوندی کے تابع ہو گی۔

10- چونکہ دین کا نظام (خلافت علیٰ منہاج رسالت) زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہو گا' اس لئے اس میں موجودہ ثنویت ختم ہو جائے گی۔ یعنی اس میں یہ نہیں ہو گا کہ سیاسی معاملات کے لئے حکومت کی طرف رجوع کیا جائے اور مذہبی یا شخصی امور کے لئے مذہبی پیشوائیت کی طرف۔ اس میں یہ دونوں شعبے باہم گرمدغم ہو جائیں گے۔

11- جب تک اس قسم کا نظام قائم نہیں ہو جاتا' امت کے مختلف فرقے جس جس طریق پر نماز' روزہ وغیرہ اسلامی احکام پر عمل کر رہے ہیں' کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ ان میں کوئی ردو بدل کرے یا کوئی نیا طریقہ وضع کر کے اسے ''خدا اور رسول ﷺ'' کا طریقہ قرار دے۔ یہ حق قرآنی نظام (خلافت علیٰ منہاج رسالت) کو پہنچتا ہے کہ وہ رفتہ رفتہ امت کے اختلافات کو مٹا کر اس میں وحدت پیدا کرے۔

12- قرآنی نظام کا مقصود یہ ہے کہ خدا کی متعین کردہ مستقل اقدار کے مطابق انسان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ یہ نظام تمام افراد معاشرہ کی بنیادی ضروریات زندگی' روٹی' کپڑا' مکان' علاج' تعلیم وغیرہ بہم پہنچانے کا ذمہ دار ہو۔

13- قرآن کا نظام اپنی نوعیت کا واحد اور منفرد نظام ہے اس لئے نہ وہ دنیا کے کسی اور نظام میں جذب ہو سکتا ہے نہ ان سے مفاہمت کر سکتا ہے۔ خواہ وہ مغرب کا جمہوری سرمایہ دارانہ نظام ہو' یا سوشلزم کا آمرانہ اشتراکی نظام۔ اس کے نزدیک یہ سب نظام ہائے زندگی غیر خداوندی ہیں لہٰذا باطل۔

14- جہاں تک احادیث کا تعلق ہے' ہم ہر اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں جو قرآن کریم کے مطابق ہو' یا جس سے حضور نبی اکرم ﷺ یا صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار نہ ہوتی ہو۔

15- ہم' رسول اللہ ﷺ کے بعد' ہر قسم کے مدعی وحی کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔

16- طلوع اسلام کا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے نہ مذہبی فرقہ سے (اسے فرقہ اہل قرآن سے بھی کوئی تعلق نہیں)' نہ ہی یہ کوئی نیا فرقہ پیدا کرنا چاہتا ہے اس لئے کہ اس کے نزدیک دین میں فرقہ سازی شرک ہے۔ امت کے مختلف فرقے جس طریق سے نماز' روزہ وغیرہ کی ادائیگی کرتے ہیں' ہم ان میں کسی قسم کا ردو بدل نہیں کرتے۔ ہم صرف قرآن کریم کی تعلیم کو عام کرتے ہیں تاکہ کسی طرح پھر سے قرآنی نظام (خلافت علیٰ منہاج رسالت) کا قیام عمل میں آ سکے۔ یہ ہے ہمارا مقصد' جسے ہم برسوں سے دہراتے چلے آ رہے ہیں۔

(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL.74
ISSUE
04

Monthly
TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546, 042-35753666
E-mail:idarati@gmail.com
Web:wwwtoluislam.org www.facebook.com/talueislam/





یہ وہ لوگ ہیں جو اُن تمام صداقتوں پر ایمان رکھتے ہیں جو (اے رسول!) تجھ پر بذریعۂ وحی نازل کی گئی ہیں، اور جو تجھ سے پہلے پیغمبروں کو اُن کے اپنے اپنے وقت میں دی گئی تھیں (اور جو اب قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہیں) — اِن صداقتوں پر ایمان رکھنے کے معنی یہ ہیں کہ وہ صحیح تاریخی شہادتوں سے اِس نتیجہ پر پہنچ جائیں کہ اِس پروگرام پر اِس سے پہلے بھی کئی بار عمل ہو چکا ہے اور اس سے ہر بار وہی نتائج پیدا ہوئے ہیں جن کا اب وعدہ کیا جاتا ہے، اس لیے اب بھی وہی نتائج مرتب ہوں گے — وہ اِس طرح اِس حقیقت پر یقین رکھتے ہیں کہ اِس ضابطۂ خداوندی پر عمل کرنے سے ایک نئی زندگی کی نمود ہو جاتی ہے اور یوں حال کی جدوجہد سے اِنسان کا مستقبل روشن ہو جاتا ہے — وہ مستقبل جس کا سلسلہ اسی دنیا تک محدود نہیں بلکہ وہ مرنے کے بعد بھی آگے چلتا ہے۔

(مفہوم القرآن سورۃ البقرہ:4)